ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
مئی 2024ء
اشاعت کا اِسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

محنت کشوں کو سلام!

یکم مئی 2024
مزدور کا دن



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوبِ تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
مئی 2024ء

جلد 77 | شمارہ نمبر 5

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: مزدور کی اُجرت کے مسئلہ کا حل، (2) ایک اور ایٹمی دھماکا	ادارہ	4
درسِ قرآن (سورۃ النساء آیات 144 سے 155 تک)	پرویز علیہ الرحمۃ	11
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت کا تعارف اور پیش منظر	پرویزؒ	35
بیادِ علامہ غلام احمد پرویزؒ	آصف جلیل	44
یکم مئی (قرآنِ کریم کی رُو سے ہر انسان محنت کش ہے)	سید حیات النبی رضوی، کراچی	47
باب المراسلات	ادارہ	53

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Surah Muhammad (محمّد) - Durus-al-Qur'an: Chapter 6 By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)	59

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مزدور کی اُجرت کے مسئلہ کا حل

مزدوروں کے مسئلہ کا حل نہ سرمایہ داری میں ہے نہ اشتراکیت میں۔ نہ یورپ کے پاس ہے نہ چین کے۔ اس کا علاج نہ مزدوروں اور محنت کشوں کی ہڑتالوں میں ہے نہ ان کے ساتھ مفاہمت میں۔ اس سارے فساد کی جڑ ''مزد'' (اُجرت) کا غلط نظریہ ہے' اور جب تک یہ نظریہ باقی ہے' یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اس کا حل صرف قرآن کے معاشی نظام میں مل سکتا ہے جس کی بنیاد حیاتِ آخرت کے ایمان پر ہے۔ اس نظام میں ہر فردِ معاشرہ محنت کش یا کام کرنے والا (ورکر) ہوتا ہے اور ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا ''صلہ'' ملتا ہے لیکن یہ صلہ اُجرت کی شکل میں نہیں ہوتا۔ یہ صلہ ملتا ہے یہاں کی طبعی زندگی کے لئے سامانِ پرورش اور آخرت کی زندگی کے مدارج کے تعین کی شکل میں۔ قرآن کریم میں شروع سے آخر تک دیکھ جایئے' اس میں صلہ یا بدلہ عمل کا ملتا ہے۔ ''مذہب'' کی دنیا میں (عمل کی جمع) اعمال سے مراد چند مخصوص رسمیں ہوجاتی ہیں لیکن عمل کے سیدھے سادے معنی کام ہیں۔ اور جب کوئی کام' دین کے پروگرام کے مطابق کیا جائے تو وہ عملِ صالحہ بن جاتا ہے۔ ان اعمال (کاموں) کا بدلہ اس دنیا میں' رزقِ کریم (باعزت روٹی) کی شکل میں ملتا ہے' اور آخرت میں خوشگوار زندگی کی صورت میں۔ لہٰذا اسلامی معاشرہ میں ہر فرد' کام کرنے والا (ورکر) ہوتا ہے۔ وہ کام کرتا ہے اور معاشرہ اس کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچاتا ہے۔ جہاں تک طبعی زندگی کی ضروریات کا تعلق ہے' یہ قریب قریب ہر انسان کی یکساں ہوتی ہیں۔ وہ کونسا قانونِ فطرت ہے جس کی رُو سے کہا جائے گا کہ مل کے مالک کے بچے کے لئے ناشتہ میں دودھ' انڈے' مکھن' توش' پھل ضروری ہیں اور مزدور کے بچے کے لئے سوکھی' باسی روٹی کا ٹکڑا کافی۔ خدا نے تو ان دونوں بچوں کا نظامِ پرورش ایک جیسا بنایا ہے۔ یہ تفریق رزق کی غلط تقسیم کی پیدا کردہ ہے' جس کا جواز اجرت کے نظریہ کی شکل میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

کارل مارکس کو بھی اس کا احساس ہوگیا تھا کہ صحیح معاشی نظام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اجرت کا

تصور ہے اس لئے اس نے کہا تھا کہ صحیح نظام ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام اور ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق معاوضہ کے اصول پر قائم ہو سکے گا۔ لیکن جب اس سے کہا گیا کہ آپ اس نظام کو عملاً نافذ کرنے کا طریق کیوں نہیں بتاتے یا رائج نہیں کرتے' تو اس نے کہا کہ مجھے وہ بنیاد نہیں ملتی جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہو سکے۔ اس لئے میں سردست اسے معرضِ التوا میں رکھتا ہوں۔ شاید ''زمانے کے تقاضے'' انسان کو اُس مقام تک لے آئیں۔

یہاں پر ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کارل مارکس نے بات تو سمجھ لی تھی لیکن اسے اس کی اساس نہیں ملتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام ''بات سمجھ لینے'' سے قائم نہیں ہو سکے گا۔ جس نظام کو محض قانون کے زور پر قائم ہونا ہو' اس کے لئے ''سمجھ لینا'' کافی ہوتا ہے۔ لیکن جس نظام کا سرچشمہ ''دل کی گہرائیوں'' سے پھوٹتا ہو' اسے سمجھ لینے کے بعد' ایمان کی حیثیت سے قبول کرنا اولین شرط ہوگا۔ یہ وجہ ہے کہ جو قرآن کا نظام اس جماعت (کے ہاتھوں ہی نہیں بلکہ اس جماعت) کے اندر قائم ہوتا ہے' جس کے افراد حیاتِ آخرت کو ایمان کا درجہ دے چکے ہوں -- ''ایمان'' کے معنی یہ ہیں کہ ان کا کوئی عمل' اقدارِ خداوندی کے خلاف نہ ہو۔ اس قسم کے افراد کو قرآنِ کریم نے مومنینؔ اور ان پر مشتمل جماعت کو اُمت مسلمہ کہہ کر پکارا ہے۔

لہٰذا' سوال اتنا ہی نہیں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے! یہ طے ہو جانے اور سمجھ میں آ جانے کے بعد بھی' اصلی سوال یہ ہوگا کہ کیا وہ لوگ بھی موجود ہیں جن کے ہاتھوں اور جن کے اندر' یہ نظام عملاً متشکل ہوگا۔ یعنی وہ لوگ جن کا خدا کے قانونِ مکافات (حیاتِ آخرت) پر یقینِ محکم ہو!

کاروبار کیسا بھی ہو اس کو فروغ دینے میں ویب سائٹ نہایت کارآمد ہے۔
ہر طرح کی ویب سائٹ بنوانے کے لئے ہم سے رجوع کریں۔
تعلیمی، قانونی، آن لائن سٹور، سفریات، کھیل، ہوٹل، ہوم ڈیلیوری، ذاتی وغیرہ
مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں یا ویب سائٹ وزٹ کریں
Jamshed Tech
WhatsApp: +92 335-7651490
https://www.jamshedtech.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

❷ ایک اور ایٹمی دھماکا
یعنی قرآنی نظام معاشرہ کا قیام عمل میں لایا جائے

مئی 1998ء کے اواخر میں پاکستانی پریس نے ملکی صورتحال کی جو تصویر کشی کی وہ الفاظ کے تھوڑے بہت تغیّر کے ساتھ کچھ اس طرح سامنے آئی۔

28 مئی کا دن پاکستان ہی نہیں، دنیائے اسلام کی تاریخ میں بھی ہمیشہ ایک یادگار دن رہے گا۔ جب پاکستان نے چاغی کے مقام پر یکے بعد دیگرے پانچ کامیاب ایٹمی دھماکے کر کے خود کو عالمی ایٹمی کلب کے معدودے چند ارکان میں شامل کر لیا۔ اس طرح بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے بعد علاقے میں طاقت کا جو توازن بگڑ گیا تھا پاکستان نے اسے اپنے حق میں تبدیل کر لیا ہے۔ وزیراعظم پاکستان کے الفاظ میں پاکستان نے بھارتی ایٹمی دھماکوں کا حساب چکا دیا ہے بلکہ ایک مزید دھماکہ کر کے اس خطے میں بھارتی بالادستی کے خواب کو درہم برہم کر کے ہندو ذہنیت کے غرور کو خاک میں ملا دیا ہے۔ پاکستان نے یہ فیصلہ کرنے میں کافی تاخیر سے کام لیا چونکہ وہ بھارتی اقدام کے خلاف بڑی طاقتوں اور عالمی برادری کا ردعمل بغور دیکھ رہا تھا مگر جب بڑی طاقتوں اور عالمی برادری نے بھارت کے دوسرے نامنصفانہ اقدامات کی طرح اس سنگین واقعے سے چشم پوشی کی اور اس ''جرم'' کی پاداش میں بھارت کو محض رسمی اور معمولی سرزنش ہی کا مستحق گردانا گیا تو پاکستان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنی آزادی، سلامتی اور قومی غیرت کا تحفظ کرنے کی خاطر اپنی ایٹمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے دنیا پر اور خصوصاً اپنے ازلی دشمن پر واضح کر دے کہ پاکستانی قوم کسی قیمت پر بھی اپنی آزادی کا سودا نہیں کرے گی خواہ اس کے لئے کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ اس میں انہیں ساری قوم کی تائید حاصل ہے۔ پاکستانی قوم، پاکستانی افواا اور پاکستانی سائنسدان مبارکباد اور تحسین کے مستحق ہیں جنہوں نے دشمن کا منہ توڑ جواب دے کر اپنے عزم و ارادے کا اظہار کر دیا ہے۔ پاکستان کو جوابی ایٹمی دھماکے سے روکنے کے لئے امریکہ، برطانیہ، جاپان اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں نے بہت لالچ دیئے اور خطرناک سنگین نتائج کی دھمکیاں بھی دیں مگر وزیراعظم کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور

انہوں نے ان برائے نام وقتی سہولتوں کی خاطر قومی وقار اور مفادات کا سودا کرنے سے انکار کر دیا اور امریکہ، یورپ اور دیگر عالمی طاقتوں کی مخالفت، پابندیوں اور دھمکیوں کو نظر انداز کر کے دنیا کی ایٹمی طاقتوں میں پاکستان کا نام لکھوالیا۔ اسلام دشمن طاقتیں پاکستان کے ایٹم بم کو ''اسلامی بم'' کا نام دے کر اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور دنیا کو اس کے مضمرات سے ڈرانے میں مصروف رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو عالم اسلام کے سامنے سرخرو کر دیا ہے اور اس نے صحیح معنوں میں دنیائے اسلام کا ''ناقابل تسخیر قلعہ'' کہلانے کا اعزاز حاصل کر لیا ہے۔ اسلامی ملکوں نے ان تجربات پر جس دلی مسرت کا اظہار کیا ہے وہ ان کی آرزوؤں اور اُمنگوں کا آئینہ دار ہے۔ سعودی عرب اور دوسرے اسلامی ممالک کے علاوہ چین اور دوسرے دوست ممالک نے اعلان کیا ہے کہ وہ نامساعد حالات میں پاکستان کو ہر ممکن امداد فراہم کریں گے۔

اپریل 1998ء کے اداریہ میں طلوع اسلام نے لکھا تھا کہ اب جب کہ بھارت ایٹمی دھماکے کر کے اپنی قوت کا مظاہرہ کر چکا ہے پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے قرین مصلحت ہی نہیں بلکہ حکم خداوندی ہے کہ ''تم اپنے ہاں امکان بھر قوت فراہم کرو تا کہ اس سے تمہارے اور نظام خداوندی کے دشمنوں کے دل میں تمہاری دھاک بیٹھی رہے۔ ان دشمنوں کے علاوہ ان دشمنوں کے دلوں میں بھی جنہیں ابھی تم نہیں جانتے لیکن خدا کو ان کا علم ہے۔'' (8:60) ہمارے لئے یہ امر باعث مسرت ہے کہ وزیر اعظم نواز شریف کے مطابق، ایٹمی دھماکہ کرنے سے پہلے وہ بیرونی دباؤ اور متوقع خطرات کے پیش نظر زبردست ذہنی اضطراب میں مبتلا تھے۔ ایسے میں، بقول ان کے، انہوں نے یہ معاملہ قرآن کی بارگاہ میں پیش کیا تو ان کے ذہن پر قرآن مجید کی وہی آیت ابھری جس کا ذکر طلوع اسلام کر چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم نے انہیں حوصلہ بخشا۔ انہوں نے بزن کہا اور بلوچستان کے بلند و بالا پہاڑ تجرباتی دھماکوں سے لرز اٹھے۔ بھارت کے بتکدوں میں بھونچال آ گیا اسلامی دنیا کو یقین آ گیا کہ احکام خداوندی کی بجا آوری کتنی اہم اور بروقت تھی۔

یہ درست ہے کہ کشمکش میں قوت کا مقابلہ قوت سے ہوتا ہے۔ جس کے پاس زیادہ قوت ہوگی وہ کامیاب ہو جائے گا۔ فتح اور شکست کا عام اصول یہی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی ایک اور عنصر بھی ہے جو شکست اور فتح کے معاملہ میں بڑا گہرا اثر رکھتا ہے۔ وہ عنصر یہ ہے کہ تم کس قسم کے اصول اور نظام کی خاطر لڑ رہے ہو؟ اگر تم اس صحیح نظام کی خاطر مصروف جدوجہد ہو جو تمام نوع انسانی کی بھلائی کی خاطر قائم کیا جا رہا ہے تو اس اصول کی قوت بھی تمہارے ساتھ ہوگی اور تمہاری اپنی قوت کی تھوڑی بہت کمی اس اصول کی قوت سے پوری ہو جائے گی۔

اندریں حالات ہماری نظر میں کامیاب ایٹمی دھماکے کر کے مطمئن ہو جانا کافی نہیں اقوام عالم میں آگے بڑھنے کے لئے ہمیں اپنی اصل منزل کی طرف بھی قدم بڑھانا ہوگا تا کہ جس مملکت کا خواب علامہ اقبالؒ کی چشم بینا نے دیکھا اور جس کا

تصور قائداعظمؒ کی نگہ بلند نے دیا تھا وہ حقیقت بن کر سامنے آجائے اور وہ منزل پاکستان کے لئے ایک خطہ زمین کا حصول تو نہ تھی کہ ایٹم بم بنا لینے سے وہ خطہ زمین محفوظ ہو گیا۔ وہ منزل اس خطہ زمین میں صحیح قرآنی مملکت کا قیام ہے جس پر کام ہونا ابھی باقی ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے (اور یہ دعویٰ ہمارے ایمان پر مبنی ہے) کہ اسلام اللہ کی طرف سے عطا کردہ، آخری اور مکمل دین (ضابطۂ حیات) ہے جو نوع انسانی کی تمام مشکلات، یعنی زندگی کے تمام بنیادی مسائل، کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کیا ہے تو اس کے جواب میں مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں اور جب ان آوازوں کو یکجا کیا جائے تو ان کا ماحصل نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اب ظاہر ہے کہ جس اسلام کا تصور صرف اس قدر ہو وہ (تمام نوع انسان کی مشکلات تو ایک طرف خود) مسلمانوں کی مشکلات کا حل بھی پیش نہیں کر سکتا۔ اسلام ایک نظام زندگی ہے، جس کی بنیادیں مستقل اقدار (Permanent Values) پر قائم ہیں۔ جب تک یہ بنیادی مستقل اقدار واضح، غیر مبہم اور متعین طور پر سامنے نہ آجائیں، یہ سمجھ نہیں آسکتا کہ وہ نظام زندگی ہے کیا جسے اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو زندگی کے اہم مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔

اپنی تقدیر سنوارنے کے لئے ہمیں اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھنا ہوگا کہ قرآن کا منتہیٰ، وحدت قانون کی بنیاد پر، تمام نوع انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنانا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ کان الناس امۃ واحدۃ (2:213) ''تمام نوع انسانی ایک قوم تھی'' اور یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔ سو جو نظام تمام انسانوں کو ایک برادری کے قالب میں ڈھالنے کا پروگرام اپنے سامنے رکھتا ہو، خود اپنے اندر فرقوں اور پارٹیوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانوں کی تقسیم کا معیار ایک ہی ہے، یعنی کفر اور ایمان (64:2)، نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے وہ آغاز کار کے طور پر ایک اُمت تشکیل کرتا ہے جسے وہ اُمت مسلمہ کہہ کر پکارتا ہے۔ اس اُمت کی وحدت، توحید کی مظہر ہے۔ اس لئے تفرقہ (فرقہ بندی) اس کے نزدیک شرک اور کفر ہے (30:31-32)۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ ایسے لوگوں سے تیرا کوئی واسطہ نہیں جو دین میں فرقے پیدا کرتے ہیں (6:160) باہمی اختلافات اس کے نزدیک اللہ کا عذاب ہے (3:104) اور اس سے محفوظ رہنا اللہ کی رحمت (11:118)۔ ہم ان آیات کو خوب جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں لیکن غیر قرآنی روش نہیں چھوڑتے۔

آپ سوچئے کہ کہاں اُمت کا یہ مقصد کہ تمام اقوام عالم کے اختلافات مٹا کر، انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے اور کہاں اس اُمت کی اپنی یہ حالت کہ دو مسلمان خانہ خدا میں رو بہ قبلہ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے! یہ ہے فرقہ پرستی کا نتیجہ اور اس کی واحد ذمہ دار ہے مذہبی پیشوائیت جو مروجہ مذہب (فرقوں والے اسلام) کو دین خداوندی بتا کر اُمت کو تھپکیاں دے دے کر سلائے رکھتی ہے۔ یہ ہمارے کانوں میں یہ سحر پھونک دیتی ہے کہ ہمارے

فرقے، وہ، فرقے نہیں جنہیں قرآن شرک قرار دیتا ہے، یہ ''مکاتب فکر'' ہیں۔ اس نے الفاظ کے ذرا سے پھیر سے اُس شرک، (فرقہ پرستی کے شرک) کی گرہیں اور مضبوط کر دیں لیکن الفاظ کے بدل جانے سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔ سنکھیا تو سنکھیا ہی رہتا ہے خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔

قوم میں ایک نئی روح پھونکنے کے لئے اور اس میں اجتماعی زندگی اور مسلم قومیت کا شعور پیدا کرنے کے لئے چند گزارشات، وزیراعظم کے غور وفکر کے لئے پیش خدمت ہیں:

1۔ دستور میں قرآن حکیم کی مکمل اور غیر مشروط بالادستی کو قائم کرنے کے لئے مناسب ترامیم جتنی جلد ممکن بنائی جائیں۔

2۔ وطن یا نسل کو بنائے قومیت قرار دینے سے، قوم کی تشکیل کے لئے کسی قسم کی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی، ہر بچہ پیدائشی طور پر اس قوم کا فرد ہوتا ہے جس میں وہ پیدا ہو لیکن کسی نظریہ کی بنا پر قوم کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے بچوں کو اس نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ ہم نے اس اہم مقصد سے نہ صرف اغماض برتا بلکہ دین کی تعلیم کو مذہبی پیشوائیت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ آج ہم اپنی اس غفلت کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ ہماری نئی نسلیں ہمارے نظریۂ حیات ___ نظریۂ پاکستان ___ سے ہی بیگانہ ہو رہی ہیں۔ اب اس نظریہ کے تحفظ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کو قوم کا نصب العین حیات قرار دیا جائے۔ اسے نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے نصاب میں داخل کیا جائے تاکہ پاکستان کا مستقبل مستحکم ہو سکے۔ چونکہ جس اسلامی مملکت کے قیام کے لئے وزیراعظم کوشاں ہیں اس کی عمارت کی بنیاد اسی نظریۂ حیات پر اٹھتی ہے، اس لئے اس نظریہ کا تحفظ اور اس کی تعلیم وزیراعظم کی ذاتی ذمہ داری ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ مملکت کا شعبہ تعلیم وتربیت (بشمول دینی تعلیم) وزیراعظم کی ذاتی نگرانی میں ہو، تاکہ نظریۂ حیات پر مبنی ایک ایسا نصاب تعلیم تیار کیا جائے، جو پوری قوم میں وحدت فکر وعمل پیدا کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہو اُمت کی وحدت کی بنیاد یاد رہے ایک اللہ کے ایک ضابطۂ حیات اور ایک نصاب/ ضابطہ تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے۔

3۔ ملت میں وحدت فکر، قرآن حکیم کو قرآن ہی سے سمجھنے سے پیدا ہوگی۔ روایات سے نہیں، جو ہر مذہبی فرقے کی الگ الگ ہیں۔ وقت کی اہم ضرورت ہے کہ قرآن حکیم کے معانی ومفہوم کا ایک ایسا مستند نسخہ حکومت کی نگرانی اور ذمہ داری میں، تیار کیا جائے جو منجملہ اور باتوں کے، اسلام کے ان بنیادی اور غیر متبدل اقدار اور اصولوں کو اجاگر کرے جن پر اسلامی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے اور جو زندگی کے اہم مسائل کا حل اپنے اندر رکھتے ہیں۔ حکومت کا تیار کردہ اور منظور کردہ یہ قرآنی نسخہ تمام چھوٹی بڑی تعلیمی درس گاہوں (بشمول دینی درس گاہوں) ریڈیو، ٹی وی، سرکاری دفاتر اور دیگر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں صحیح قرآنی تعلیم پھیلانے کا واحد ذریعہ ہوگا۔ قرآنی تعلیم سے مراد وہ تعلیم نہیں جو ہمارے مدارس میں ''دینی علوم''

کی شکل میں دی جاتی ہے۔ طلباء کے لئے قرآن کی تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ متعلم، علی وجہ البصیرت یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ بلاشک وشبہ یہ کتابِ عظیم نوع انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور انسانیت کی مشکلات کا حل اس کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

4۔ اسی طرح، قرآن حکیم کی روشنی میں، حضور نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر بھی ایک مستند کتاب، حکومت کی نگرانی میں تیار کی جائے، جو منجملہ اور باتوں کے، اس اسلامی نظام پر بھی روشنی ڈالے جو حضور ﷺ نے قائم فرمایا تھا اور جو حضور ﷺ کے بعد، خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں آگے چلا، کیونکہ:

''وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی''

ان گزارشات کا واحد مقصد فرقہ پرستی کے رجحان کو ختم کر کے ملت میں وحدت فکر کے فروغ کی حوصلہ افزائی ہے۔ یہ مقصد راتوں رات حاصل نہیں ہو جائے گا۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے میر کارواں کو نہایت احتیاط سے پلاننگ کرنا ہوگی کہ مقصد بھی حاصل ہو جائے اور ''بھڑوں کا چھتہ'' بھڑ کے بھی نہیں۔ اس کے لئے قرآنی دعوت کا دیا جلانا ہوگا (3:102) اور اس کو دنیاوی اسباب وذرائع کے تیل سے نہیں بلکہ اپنے خون جگر سے جلائے رکھنا ہوگا۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار!
(اقبالؔ)

آخر میں ایک بار پھر سن لیجئے! ہمارے معاشرہ کا بگاڑ اللہ کی مقدس کتاب کے ساتھ مسلسل کھیل کھیلنے کی بنا پر ہے۔ اگر ہم نے یہ کھیل بند نہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی نہ کی ان اتبع الا ما یوحی الی (7:203، 10:15، 46:9) اور قرآن اور صرف قرآن کو اپنے آئین کی بنیاد نہ بنایا تو پھر فطرت کے فیصلے کا انتظار کیجئے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ جب کوئی قوم مہلت کے وقفہ سے فائدہ نہ اٹھائے اور اپنی ذہنیت نہ بدلے، اپنی روش نہ بدلے تو:

(47:38) کے مطابق

''اگر تم اس نظام سے روگردانی کرو گے اور اپنے عہد سے پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہاری جیسی نہ ہوگی۔''

یہی وہ اصول خداوندی ہے جس سے ہمیں ڈرنا چاہئے کہ وہ ہمیں مہلت کے وقفے بار بار نہیں دے گا۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

(ماہنامہ طلوع اسلام، جولائی 1998ء سے ماخوذ)

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ النساء آیات 144 سے 155 تک

درسِ قرآن

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡكٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ اَتُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ عَلَیۡكُمۡ سُلۡطٰنًا مُّبِیۡنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ نَصِیۡرًا ﴿۱۴۵﴾ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَاعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰهِ وَاَخۡلَصُوۡا دِیۡنَهُمۡ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ وَسَوۡفَ یُؤۡتِ اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا یَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمۡ اِنۡ شَكَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیۡمًا ﴿۱۴۷﴾ لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الۡجَهۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِیۡعًا عَلِیۡمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنۡ تُبۡدُوۡا خَیۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیۡرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَكۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِكَ سَبِیۡلًا ﴿۱۵۰﴾ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّهِیۡنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمۡ یُفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ اُولٰٓئِكَ سَوۡفَ یُؤۡتِیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۵۲﴾ یَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَیۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤی اَكۡبَرَ مِنۡ ذٰلِكَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلۡمِهِمۡ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَیِّنٰتُ فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَیۡنَا مُوۡسٰی سُلۡطٰنًا مُّبِیۡنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِیۡثَاقِهِمۡ وَقُلۡنَا لَهُمُ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِی السَّبۡتِ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّیۡثَاقَهُمۡ وَكُفۡرِهِمۡ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ وَّقَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۱۵۵﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1971ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النساء کی آیت 144 سے ہو رہا ہے: (4:144)۔

(1) کافر اور منافق کے علاوہ مذہب اور دین میں فرق کی نوعیت:

پچھلے اتوار کو الیکشن کی پابندیوں کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا تھا۔ اس لیے تجدید یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ بات منافقین کی چلی آ رہی تھی۔ قرآنِ کریم نے منافقین اور کفار کو یوں تو ایک ہی کیٹگری (شق) میں رکھا ہے لیکن جیسا کہ ذرا

آ گے چل کر ہمارے سامنے بات آئے گی' وہ منافقین کو کافروں سے بھی زیادہ بدتر مخلوق قرار دیتا ہے۔ خدا کی طرف سے جو دین ہے' وہ انفرادی چیز نہیں ہے۔ مذہب انفرادی ہوتا ہے' یہ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق ہوتا ہے' یہ پوجا پاٹ' گیان دھیان اور پرستش ہے' بس اتنا ہی تعلق ہوتا ہے اور اسے ہر فرد الگ الگ' اپنی اپنی جگہ' انفرادی طور پر کر سکتا ہے بلکہ اس میں جتنی زیادہ انفرادیت ہو' تنہائی ہو' خلوت ہو' علیحدگی ہو' وہ اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے سادھو ہوں' سنیاسی ہوں' بن باسی ہوں' عیسائیوں کے Saints (صوفی) ہوں' مسلمانوں کے صوفی اور اولیاء اللہ ہوں' یہ آبادیوں سے بھی دور بھاگتے ہیں' جنگلوں میں چلے جاتے ہیں' اگر آبادی میں رہتے ہیں تو خلوتوں میں رہتے ہیں' حجروں میں رہتے ہیں' خانقاہوں میں رہتے ہیں' زاویوں میں رہتے ہیں۔ گویا جتنا زیادہ کوئی تنہا ہوتا چلا جائے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اتنا ہی خدا سے تعلق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مذہب میں یہی شکل ہوتی ہے۔

یہ انسان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہوتا ہے۔ جیسا ذہن نے تصور کر لیا اس کے مطابق راستے اختیار کر لیے لیکن دین اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ وہاں تو کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (9:119) ہونا پڑتا ہے یعنی سفرِ زندگی صادقین افرادِ کارواں کی معیت میں طے کرنا پڑتا ہے اور جنت میں جانے کے لیے ضروری ہے کہ: فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ (89:29) میرے بندوں میں داخل ہو پھر جنت میں جا سکتا ہے۔ یہ ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اب اس اجتماعیت کی پہلی بنیادی شرط یہ ہے کہ جو لوگ اس نظریئے پر ایمان رکھیں' اس تصورِ حیات پر یقین رکھیں تو یہ جنہیں جماعت مومنین کہا جاتا ہے' وہ دوسروں سے الگ ایک جماعت بنے گی۔

(2) مذہب کی بنیاد سیکولرازم پر استوار ہوتی ہے اور دین کی دوقومی نظریئے پر

مذہب میں یہ تمام امور مشترک ہوتے ہیں۔ کافر ہوں' مومن ہوں' ہندو ہوں' مسلمان ہوں' سکھ ہوں' عیسائی ہوں' یہ جسے سیکولر نظام کہتے ہیں اس میں ان تمام دنیاوی امور کے فیصلے وہ مشترکہ طور پر کر سکتے ہیں اور اپنی پوجا پاٹ' ایشور کی بھگتی' پرستش' عبادت کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کو سیکولر نظام کہا جاتا ہے۔ اس میں دنیاوی امور کے فیصلے مومن اور کافر کا امتیاز کیے بغیر' اکٹھے ہو کر' باہمی مشورے سے ہی سہی' یوں طے کر لیے جاتے ہیں اور Personal (شخصی) معاملات میں ہر ایک کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے دین اور دھرم یعنی مذہب کے مطابق ان کے فیصلے کر لے لیکن جب دین آئے گا تو اس میں تو یہ ایک منفرد جماعت بنے گی' جو صرف انہی لوگوں پر مشتمل ہوگی جو اس نظریۂ حیات پر یقین اور ایمان رکھیں جو قرآن کریم نے دیا ہے۔ اسی چیز کو آج کی اصطلاح میں دوقومی نظریہ کہتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے یہ واضح طور پر کہا ہے کہ ہم نے انسانوں کو پیدا کیا' ان میں سے ایک جماعت مومنین کی ہوتی ہے' دوسری کفار کی ہوتی ہے۔ اپنے ذہن میں جب ہم کفار کہتے ہیں تو غیر مسلم بھی اس لفظ کو ایسے سمجھتے ہیں جیسے گالی دیدی ہو۔ یہ کوئی گالی کی بات نہیں' یہ تو وہ ہے جسے کسی سوسائٹی کا Member & Non-Member کہتے ہیں۔ یہ بالکل وہی چیز

ہے۔اس سوسائٹی میں کچھ اس کے ممبرز ہوتے ہیں اور دوسرے نان ممبرز ہوتے ہیں۔اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی سوسائٹی' کوئی انجمن' کوئی اجتماعیت بھی ایسی نہیں ہوتی کہ اس میں ممبرز اور نان ممبرز دونوں اکٹھے ہو جائیں اور آپ اس کو سوسائٹی کہہ دیں۔ رسول اللہ ﷺ کے حقیقی چچا اور جتنے رشتہ دار' عزیز تھے وہ دوسری قوم کے افراد تھے' قومیت کی تشکیل کی بنیاد دین نے یہ دی کہ نظریۂ زندگی میں اشتراک ہو' ایمان پر اشتراک ہو۔جیسا میں نے کہا اس چیز کو دوقومی نظریہ کہتے ہیں۔

(3) دوقومی نظریہ کے بنیادی لوازمات جن کو پیشِ نظر رکھے بغیر اسلامی مملکت کا خواب پورا نہیں ہوسکتا

پاکستان کا تصور خالص اسلام اور دین کی بنیادوں پہ علامہ اقبالؒ نے دیا تھا۔اس مطالبے کی پہلی بنیاد یہ تھی کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر' ایک الگ قوم ہے۔کوئی غیر مسلم اس قوم میں شریک نہیں ہوسکتا۔یہ کسی دوسری قوم کے ممبر نہیں ہوسکتے۔اور دوسری چیز یہ کہ یہ جو الگ قوم بنتی ہے' اگر انہوں نے مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی ہے' تو ان کے لیے اپنی آزاد مملکت کا ہونا ضروری ہے۔اسلام ایک زندہ حقیقت بن نہیں سکتا تاوقتیکہ اس امت کو' اس ملت کو' یہ کامل اختیار و اقتدار نہ ہو کہ وہ خدا کے احکام کو نافذ کرسکیں۔یہ تھی بنیاد پاکستان کے حصول کی۔یہ جو چیز ہے کہ یہ ایک الگ منفرد قوم ہے تو اس کی مملکت میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے گا' انصاف کیا جائے گا' عدل کیا جائے گا' انہیں انسانوں کے حقوق دیئے جائیں گے لیکن جو چیزیں اس قوم کے ساتھ مختص اور مخصوص ہیں' ان میں وہ شریک نہیں کیے جاسکتے۔اور سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس مملکت میں جو اس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر متشکل ہوتی ہے جو نان ممبرز ہیں ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہیں قائم کیے جاسکتے' رازدارانہ تعلقات قائم نہیں کیے جاسکتے۔اسی لیے کہا کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (4:144)۔یہاں منفی اور مثبت دونوں چیزیں آ گئیں۔یہ جو رفاقت کے' دوستداری کے' سرپرستی کے' دم سازی کے' ہم آہنگی کے باہمی تعلقات ہیں یہ صرف اس جماعت کے ممبرز کے ساتھ ہونگے جنہیں مومنین کہا ہے' نان ممبرز کے ساتھ یہ تعلقات قائم نہیں ہوسکیں گے۔اس آیت میں کہا ہے کہ ایسا کبھی نہ کرو کہ مومن سے ورے ہی تم ان غیر ممبران (غیر مسلم) کو اپنا دوست رازدار بنالو۔

(4) کوئی غیر مسلم' جماعتِ مومنین کا خیر خواہ نہیں ہوسکتا کیوں؟ اور مسلم مملکت کے دو لوازمات:

یہاں تو صرف اتنی سی چیز ہی کہی ہے' اس سے پہلے تو بڑی ہی تفصیل سے اس کے متعلق چیزیں آ چکی ہیں۔سورۃ آل عمران میں آپ دیکھ چکے ہیں' درس میں وہ آیت آ چکی ہے کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (3:118) اے جماعت مومنین! اپنوں کے علاوہ کسی کو اپنا رازدار نہ بناؤ' اپنے رازداروں میں شریک نہ کرو۔سیدھی سی بات ہے کہ اگر کوئی نان ممبر یا کوئی غیر مسلم آپ کے شریک حکم ہوتا ہے' شریکِ حکومت ہوتا ہے' آپ کی مملکت کے امور کے اندر برابر کا شریک ہوتا ہے تو اس سے کوئی راز چھپا ہوا نہیں رہ سکتا' اور کوئی راز چھپایا بھی نہیں جاسکتا۔قرآن مجید کا یہ حکم ہے کہ يٰٓاَيُّهَا

الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَۃً مِّنۡ دُوۡنِکُمۡ لَا یَاۡلُوۡنَکُمۡ خَبَالًا (3:118) یاد رکھو! یہ کتنے ہی تمہارے اپنے کیوں نہ بنیں، وہ تمہاری تباہی میں، تمہاری تخریب میں، کوئی کمی نہیں کریں گے۔ اور بات ٹھیک ہے۔ آپ کو ایک زندگی کا نظریہ پسند ہے، اس کے مقابلے میں وہ جو دوسرے ہیں، آپ سے متضاد نظریۂ حیات کے قائل ہیں، اب دو متضاد کششیں یک جا جمع کر رہے ہیں۔ آپ کے دین کا تقاضا ان کے تقاضوں سے بالکل مختلف و متضاد ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ (3:118) جو چیز تمہارے لیے وجۂ تکلیف اور باعثِ مصیبت ہوتی ہے، اس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ جب دو مفادات میں ٹکراؤ ہوگا تو ایک کے لیے جو چیز مفاد کا باعث ہوگی دوسرے کے لیے تکلیف کا موجب ہوگی۔ اس قسم کے متضاد عناصر کو ملا کر قوم نہیں بنایا جا سکتا، ان عناصر کو شریکِ حکم کیا ہی نہیں جا سکتا، ان کے بنیادی مقاصد الگ الگ ہیں، متاع الگ الگ ہیں، نصب العین حیات جداگانہ ہیں، ایک مشرق کی طرف جانا چاہتا ہے، دوسرا مغرب کی طرف جانا چاہتا ہے، آپ انہیں یکجا اکٹھا کیسے کر دیں گے۔ کہا ہے کہ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاہِہِمۡ ۚ وَمَا تُخۡفِیۡ صُدُوۡرُہُمۡ اَکۡبَرُ (3:118) ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی تو بے ساختگی کے عالم میں ان کے منہ سے وہ باتیں نکل جاتی ہیں جن سے تمہیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کیسے دشمن ہیں لیکن جو کچھ تمہارے خلاف یہ دلوں میں چھپا کر رکھتے ہیں، تمہیں ان کا پتہ ہی نہیں ہوتا۔ سارے قرآنِ کریم میں آپ دیکھیں گے کہ یہی حقیقت چلی آئے گی اور یہی بنیاد تھی۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ اس مملکت پاکستان کے حصول کی دو ہی چیزیں تھیں۔ ایک یہ دو قومی نظریہ ہے کہ مسلمان اپنے ایمان کی بنیاد پر، ہر غیر مسلم سے الگ ایک قوم ہے، غیر مسلم اس قوم کا فرد نہیں ہو سکتا اور دوسری یہ کہ اس مملکت کی ضرورت اس لیے ہے کہ یہاں خدا کے قوانین کو نافذ کیا جائے۔

(5) مملکتِ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ہماری نظریاتی زندگی کی زبوں حالی

ہم نے مملکت تو حاصل کر لی لیکن یہ دونوں چیزیں اس طرف سے نظر انداز ہوئیں نسیًا منسیًا ہوئیں کہ آج انہی پر حرف گیری ہو رہی ہے۔ یہ تو دہرایا جاتا رہا کہ اسلامی مملکت بنے گی اور آج تک وہ الفاظ تو بہرحال دہراتے چلے گئے، تیئیس سال [1] ہو گئے ہیں ہم سنتے چلے آ رہے ہیں لیکن یہ جو دوسری چیز تھی کہ مسلمان ان سے الگ ایک قوم ہیں، یہاں پہنچنے کے بعد اس کا تو نام ہی کسی نے نہیں لیا۔ یہ جو اقامت دین کے اتنے بڑے مدعی بنے پھرتے ہیں انہوں نے بھی اس تیئیس سال [1] میں اپنے ہاں کبھی یہ نہیں کیا کہ یہ شرط ہے کہ غیر مسلم، مسلم قوم کا فرد نہیں ہو سکتا۔ مسلم اور غیر مسلم سارے اکٹھے ہو کر جمہوریت لیے پھر رہے ہیں بلکہ انہوں نے تو پچھلے الیکشن کے دوران یہ کہہ دیا تھا کہ ہم مسلم لیگ کے کسی ممبر کے مقابلے میں ایک ہندو کو ترجیح دیں گے۔ یہ اسلامی مملکت بنانے کے دعویدار ہیں اور جو اس کے مدعی نہیں تھے بہرحال نام وہ بھی یہ لیتے تھے۔ جتنے آپ کے ہاں یہ آئین بنے ہیں، کسی میں یہ بنیادی شرط نہیں تھی کہ یہاں پاکستان کے اندر جو قوم ہے وہ مسلمان کی

[1] یاد رہے یہ بات جنوری 1971ء کی 24 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

قوم ہے' نان مسلم اقوام کے افراد نہیں ہیں۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو آئے دن کفر کے فتوے لگتے رہتے ہیں' آج تو وہ مذاق بن کر رہ گئے ہیں' ان کا کوئی عملی مفہوم ہی نہیں رہ گیا۔

(6) اسلامی مملکت میں غیر مسلم افراد کی حیثیت کے تعین کی وضاحت

کسی کو کافر قرار دینے کے سلسلہ میں اسلامی مملکت کے اندر یہ بہت بڑی چیز ہوتی تھی۔ اس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ وہ اس قوم کا ممبر فرد نہیں ہے۔ اس میں ایک تو یہ تھا کہ یہ کسی ملّا' مولوی' مفتی کا کام نہیں تھا کہ کسی کو مسلم اور کسی کو کافر قرار دیدے۔ یہ تو مملکت کا کام تھا کہ یہ Constitutionally (آئینی طور پر) بتائے کہ کون اس قوم کا فرد ہوسکتا ہے' کون نہیں ہوسکتا۔ اور جو نہیں ہوسکتے' ان کے معنی آج کی اصطلاح میں یا Constitutionally (آئین کے لحاظ سے) یہ تھے کہ وہ فرد Disfrenchise (نمائندگی یا حق رائے سے محروم) ہوجاتا تھا' وہ Disqualify (نااہل) ہوجاتا تھا' وہ آپ کی پارلیمان کا ممبر نہیں بن سکتا تھا' وہ آپ کا ووٹر نہیں ہوسکتا تھا' وہ آپ کی حکومت کے امور میں شرکت نہیں کرسکتا تھا۔ یہ جس کو آپ کفر کا فتویٰ لگا دینا کہیں وہ اس لیے تھا کہ وہ نان ممبر ہوجاتا تھا۔ کفر کے کے فتوے کے یہ معنی ہیں کہ آپ اس کو اپنی سوسائٹی سے خارج کردیتے ہیں لیکن یہاں تو کسی Constitution (آئین) میں بھی یہ بات نہیں آئی' آج کسی کی زبان پہ یہ بات نہیں آئی۔ پہلی بنیاد یہ تھی۔ اور اسلامی مملکت بنانے کی دوسری جو بنیاد تھی ابھی وہ آیت بھی آتی ہے تو میں عرض کرونگا۔ یہاں بہرحال یہ کہا ہے کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (4:144) اے جماعت مومنین! تمہارے رفیق صرف وہی ہونے چاہئیں جو تمہاری جماعت کے افراد ہوں۔ اس لیے تم ایسا کبھی نہ کرو کہ کفار کو مومنین سے ورے ہی اپنا دوست اور کارساز بنالو۔ یاد رکھو! ہ خالصتاً آئیڈیالوجی کی Basis (بنیاد) پہ جماعت بنتی ہے' جو اس آئیڈیالوجی میں Believe (یقین) نہیں کرتا' وہ تمہارا دوست نہیں ہوسکتا۔ ہمیں بھلا ان سے کیا واسطہ جو تجھ سے نا آشنا رہے۔

(7) دوقومی نظریئے کی قرآنی آئیڈیالوجی کو پیش نظر نہ رکھنے والوں کو وارننگ

برادرانِ عزیز! آگے دیکھیے کہ اس کی تہدید کتنی بڑی ہے! کہا ہے کہ: اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (4:144) کیا تم ایسا کرنا چاہتے ہو' ایسا کرو گے تو اس کے بعد پھر خدا کو تمہارے اوپر اپنا غضب اور عذاب نازل کرنے کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہے گی' تنہا یہ ایک دلیل کافی ہوجائے گی کہ تم نے اپنوں کے سوا دوسروں کو اپنا دوست' رازدار' شریک حکم' شریک مملکت بنایا' اپنی قوم کا فرد تسلیم کرلیا۔ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ غور کیجیے عزیزانِ من! لیکن آپ کا قرآنِ حکیم تو آج صرف جان [1] نکالنے کے لیے رہ گیا ہے۔

یہاں ذکر منافقین کا آرہا تھا اور میں نے گزارش کیا تھا کہ اگرچہ قرآنِ حکیم کافروں اور منافقوں دونوں کو ایک کیٹگری

[1] سورۃ یٰسین اس آخری وقت پڑھنے کی رسم اس بات کی غماز ہے

(شق) میں رکھتا ہے لیکن جو منافقین ہیں ان کے لیے کہا ہے کہ: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (4:145)۔ ذہن میں یہ آتا ہے کہ جہنم میں جو سب سے بڑا عذاب ہے' وہ بہرحال کفار ہی کو ہوگا لیکن یہاں (4:145) میں قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جہنم کے سب سے نچلے درجے کے اندر منافق ہوگا۔ غور فرمایئے! آج تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی' اس لیے کہ ہمیں پتہ نہیں کہ مومن کون ہوتا ہے' تو منافق کا کیا پتہ چلے۔ اور ابھی ابھی یہ بات سامنے آجائے گی کہ یہاں مومن ہے کون۔ قرآن کریم نے کہا یہ تھا کہ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8)۔ یہ تھی قرآن کریم کی رو سے منافق کی Definition (تعریف)۔ ان لوگوں سے جب پوچھیے کہ صاحب! آپ کون ہیں' وہ کہیں گے کہ الحمدللہ مسلمان ہوں من یقولوا کبھی اس سے انکار نہیں کریں گے کہ نہیں صاحب! میں مسلمان نہیں ہوں۔ سوچیے تو سہی کہ ہم میں سے کوئی بھی' کبھی بھی' یہ انکار کرتا ہے' یہ کہتا ہے کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ کیفیت یہ ہو چکی ہے' وہ لوگ یہاں موجود ہیں' ہمارے سامنے جو تنہائیوں میں بیٹھے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ کیا خدا' کیا رسول ﷺ' کیا ایمان! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ یہ بالکل نہیں مانتے' دہریئے ہیں اور ان چیزوں کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن جب بھی مردم شماری کے رجسٹر والا آتا ہے تو مسلمانوں کے خانے میں نام رکھاتے ہیں۔ کبھی باہر ان سے پوچھ لیجیے' کبھی نہیں کہیں گے کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ منافق میں جرأت نہیں رہتی۔ کفر اور الحاد اور دہریّت کے لیے تو بہت بڑے جگر کی ضرورت ہے۔ معاشرہ میں علی الرغم اٹھ کر کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ ہم تم میں سے نہیں ہیں' اس کے لیے جرأت کی ضرورت ہے لیکن ان کی کیفیت یہ ہے۔

(8) منافق کے سلسلہ میں نفسیاتی طور پر ہر آن جہنمی کیفیت میں مبتلا رہنے کی ایک قرآنی مثال

یہ آیات ذرا آگے چل کر آ رہی ہیں جہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ لوگ بھی تمہیں ملیں گے جو ظاہر یہ کریں گے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ آگے اس نے بتایا ہے کہ پھر ٹیسٹ کونسا ہے جہاں سے پتہ چلے کہ یہ ایمان نہیں رکھتے۔ یہاں تو منافق کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ جہنم کے عذاب کی پست ترین گہرائیوں میں ہونگے' جہنم کے سب سے عمیق غاروں کے اندر ہونگے' ہر وقت مسلسل جہنم میں ہونگے۔ عام مثال کے مطابق یوں کہیے کہ اگر ایک اسامی کے لیے بی اے ہونے کی شرط ہو تو ایک Candidate (امیدوار) فی الحقیقت بی اے ہے' وہ آیا' وہ سلیکٹ ہو گیا' وہ آ گیا' اطمینان ہو گیا۔ اس کے برعکس ایک امیدوار بی اے نہیں ہے' اس نے کہا کہ میں بی اے نہیں ہوں' انہوں نے کہا کہ تم نہیں لیے جا سکتے' ملازمت نہیں ملی' وہ چلا گیا' معاملہ ختم ہوا۔ اس ملازمت کی جو مراعات یا مفادات ہیں ان سے تو وہ محروم ہوا' دل میں کوئی آگ تو نہیں رہی۔ اب ایک امیدوار ہے' وہ بی اے نہیں ہے' آ کر کہتا یہ ہے کہ میں بی اے ہوں' وہ سلیکٹ (منتخب) ہو جاتا ہے۔

آپ سوچیے کہ یہ جو ملازمت کے (مثلاً) تیس سال ہی نہیں' اس کے بعد بھی اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (63:4) کہیں پتا کھڑکا اور اس کی جان گئی کہ پکڑا گیا' پتہ چل گیا کہ میں بی اے نہیں

ہوں۔ ملازمت کی مراعات تو ملی ہوئی ہیں' ہوسکتا ہے کہ بہت بڑے عزت کے مقام پہ بھی ہو' اس میں پھنے خاں بھی بن چکا ہو ❶ لیکن ہر وقت دھڑکا لگا ہے کہ ذرا کسی کو پتہ چل گیا تو پوچھو نہیں پھر کیا ہوگا۔ یہ ہے مسلسل جہنم۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ: نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝ (104:6-7) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔ جہنم کا یہ ہے درک اسفل۔ میں نے (اوپر مثال میں) کہا ہے کہ کافر کی صرف محرومی ہے' اس کو صرف یہ مراعات حاصل نہیں ہوئیں۔ ایک دفعہ اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں نے یہ اسامی نہیں لینی' بہرحال وہ نہیں ہے' کچھ اور سوچ لے گا۔ یہ جو بی اے نہیں تھا اور اس نے کہا تھا کہ میں ہوں' اس کی ساری زندگی جہنم کے عذاب کے اندر گزرتی ہے۔

(9) ہندوؤں کے بالمقابل آزادی کے بعد نظریاتی طور پر مسلمانوں کی پیچیدہ صورت حال کی بنیادی وجہ اور اس کا حل

ذرا سوچئے کہ کس عذاب میں ہماری قوم جکڑی ہوئی ہے۔ آزادی ہندو کو بھی ملی' ہمیں بھی ملی۔ اس نے پہلے دن سے یہ فیصلہ کرلیا کہ مذہب کو حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے' یہاں سیکولر نظام ہوگا' مذہب ذاتی پرائیویٹ معاملہ ہے' ہر ایک کو اپنے اپنے پرائیویٹ معاملے کی آزادی ہوگی' جس طرح سے جی چاہے وہ کریں' ہم اس میں دخل نہیں دیں گے لیکن امور مملکت کے اندر مذہب کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ دوسرے ہی سال Constitution (آئین) بھی بن گیا اور وہ اس نظام پر چلے جا رہے ہیں' کوئی پیچیدگی نہیں' کوئی مشکل نہیں' کوئی دشواری نہیں' کوئی Demonstration (مظاہرہ) نہیں' کوئی تحریک نہیں' کچھ نہیں۔ یہاں آپ کے ہاں تیئیس سال ❷ ہوگئے آئین سازی کے مسئلے میں' بھنور میں' آپ کی امت پھنسی ہوئی کشتی کی طرح ہے' آگے ایک قدم ہی نہیں چل سکتے۔ کیا ہوا؟ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (2:8) انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہم اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور قانونِ مکافاتِ عمل اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے' دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی مملکت بنے گی۔

(10) ماڈرن طبقے پر مذہب پرست طبقہ کا اعتراض اور پھر ان کی اپنی کارگزاری کی روداد

اب اس کے بعد دونوں کیٹگریز (شقیں) ہیں' مذہب پرست طبقہ' ماڈرن طبقے کو ہمیشہ کوستا رہتا ہے کہ یہ اسلامی مملکت نہیں بننے دیتے۔ چلئے! ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ یہ نہیں بننے دیتے' اگر ان کی طرف آجایئے جو اسلام کے مدعی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو یہاں اسلامی مملکت بنا کر رہیں گے' تیئیس (23) سال ❷ تک یہ کہتے چلے آئے کہ یہ اسلامی مملکت بنے گی اور اس میں کتاب وسنت کے مطابق قوانین نافذ کریں گے۔ کچھ تو وہ تھے کہ جنہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ مذہب پرست طبقے میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جنہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ ہوتا چلا آرہا ہے' کرتے چلے جا رہے ہیں' وہ تو یوں ہوتا

❶ آج (2011ء میں) قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران میں اس کی مثالیں موجود ہیں لیکن سوچے کون؟

❷ یہ یاد رہے کہ یہ بات 24 جنوری 1971ء کو کہی گئی تھی۔

ہے کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ (43:22) متواتر ماں باپ سے ایک روش چلی آ رہی ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اس روش پر چلتے دیکھا ہے وہ اسے دہرائے چلے جا رہے ہیں لیکن وہ بھی تھے جنہیں اس کا پتہ تھا کہ ایسا نہیں ہوسکتا اور وہ مسلسل کہتے چلے جا رہے تھے۔ قرآنِ کریم ان کے بارے میں کہتا ہے کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (2:9) خدا کو اور جماعت مومنین کو بھی دھوکا دے رہے تھے۔ جب بھی کبھی ایسا موقعہ آیا' ٹیسٹ کیس آیا' بنانے کی بات آئی' وہیں سے جھُل دے کر کسی طرف سے نکل گئے۔ منافق تو بنیادی طور پہ کہتے ہی اس کو ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ ''ن ف ق'' اس کا مادہ ہوتا ہے۔ یہ جو جنگلی چوہا ہوتا ہے' یہ ایک طرف سے بل بناتا ہے اور اس کے اندر جا کر اسی وقت دوسرا راستہ' پہلے سے کھود کر رکھ لیتا ہے کہ کہیں اِدھر سے خطرہ ہوا تو جھٹ سے اُدھر سے نکل گیا۔ منافق کے معنی ہوتے ہیں ''کسی جگہ داخل ہونے کے ساتھ ہی یہ سوچ لے کہ باہر جانے کا راستہ کونسا ہے''۔ ''او پہلاں ای فیصلہ کرلوے ایس چیز دا کہ کوئی گل نئیں نکل جاواں گا'' (وہ پہلے ہی اس چیز کا فیصلہ کر لے' انتظام کر لے کہ کوئی بات نہیں' میں نکل جاؤں گا)۔ یہ جو ان چیزوں کے مدعی بنے پھر رہے تھے انہوں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ نکلنے کا راستہ کونسا ہے۔

(11) قرآنی قوانین کی بجائے فرقہ بندی کی بنیاد پر فقہ حنفی رائج کرنے کی تجویز

اب جو وقت آیا' ٹیسٹ کیس آیا کہ صاحب! اب نئے آئین بننے والے ہیں اور اب تو راستے کی کوئی چیز روک نہیں ہے' نہ کوئی ڈکٹیٹر ہے' نہ کوئی آمریت ہے' نہ کوئی اس قسم کے لوگ ہیں' جمہوریت کی بنا پہ تم خود حکومت بناؤ' اب آؤ اسلامی قوانین بناؤ۔ یہاں پہنچنے کے بعد انہیں اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ نہیں صاحب! کتاب وسنت کی بنیادوں پہ تو آئین نہیں بن سکتا۔ ارے! کیا کہہ رہے ہیں آپ!!! تیئیس سال تک تو تم نے دہائی دے رکھی تھی' پھر اب کیا ہوگا؟ کہنے لگے کہ صاحب! فقہ حنفی رائج کر لیجیے۔ انہیں معلوم تھا کہ جو غیر حنفی لوگ ہیں' وہ اس کو Accept (قبول) نہیں کریں گے۔ کیا آپ نے کبھی ان چیزوں پر غور کیا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہ یہاں اسلامی آئین نہیں بننے دینا چاہتے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ اس میں مذہبی پیشوائیت باقی نہیں رہتی۔ کون ایسا ہے جو اپنا کاروبار بند کرا دے گا۔ آپ غور کیجیے کہ یہ کیا چیز ہوئی؟ کہ صاحب! کوئی نہیں ہے' یہاں اکثریت حنفیوں کی ہے اس لیے کہا کہ فقہ حنفی رائج کر دی جائے گی۔ انہیں معلوم ہے کہ جونہی یہ بات کہی تو غیر حنفی اٹھ کھڑے ہونگے اور ہوا بھی یہی کہ باقی اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہم اس کو اسلامی مانتے ہی نہیں ہیں۔ آپ ہم سے یہ اسلامی منوا کس طرح سکتے ہیں۔ یہ بھی جانتے تھے کہ نہیں منوا سکتے۔ ان سے کہا کہ پھر کیا بات ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی فقہ آ جائے۔ ان کی فقہ اپنی ہے' وہ فقہ حنفی کیسے مان سکتے ہیں۔ آپ غور کیجیے کہ انہوں نے کس مقام پہ کھڑا کیا ہوا ہے۔ اب یہ جو تیسرا آئین آپ کے ہاں زیر تشکیل ہے' اس میں پہلا ایشو یہ آنا ہے۔ اگر کوئی یہ نہ لائے تو سارے ملک میں آگ لگا دی جائے کہ مملکت کو اسلامی بننا ہے' ہم نے اس کو اسی چیز کے لیے حاصل کیا تھا۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے حاصل کیا تھا حالانکہ یہ سب سے زیادہ مخالفت کر رہے تھے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اسی مقصد کے لیے حاصل کیا تھا کہ اسلامی بنے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ یہ

حاصل ہی اسی لیے کیا گیا تھا۔ اور اگر وہ اس کو رکھ لیں تو اس کے بعد کیا رکھیں گے۔

عزیزانِ من! غور کیجیے یہ درک اسفل کتنا بڑا ہے! آپ ایک قدم آگے نہیں چل سکتے' سچ تو یہ ہے کہ یہ چلنے ہی نہیں دے رہے۔

(12) قرآنِ حکیم کے نزدیک مومن اور کافر کی تخصیص

قرآنِ حکیم نے تو ایک ہی بات کہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ مومن اور کافر میں فرق کیا ہے۔ آپ سوچئے۔ کہا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) اس نے تو تخصیص کی ایک ہی لائن کھینچی تھی کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) سیدھی سی بات ہے جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ کتاب اللہ کا آج بھی نام لیجیے تو آپ دیکھیے آپ کے خلاف کیا کچھ ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تو مومن کی Definition (تعریف) یہ کی ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرنے والے مومن ہیں۔ اس کو چھوڑ کر اس کے علاوہ کچھ دوسرا جو کرنے والے کافر ہیں۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ آج بھی کہہ کر دیکھ لیجیے' یہ کبھی نہیں آنے دیں گے۔ سوچیے تو سہی کہ پھر اس ملک کا کیا بنے گا۔ کہا ہے کہ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (2:8) جو دعویٰ کرتا چلا جائے کہ یہ اسلامی مملکت بنے گی اور اسلامی مملکت بنانے کے لیے جو خدا نے ایک بنیادی شرط قرار دی ہے' اس سے انکار کرتا چلا جائے اور کہے نہیں' میں انکار کر رہا ہوں۔ آپ ہر وقت ان کی زبانوں پر کتاب اللہ' قرآنِ حمید' ما انزل اللہ دیکھیں گے' یہ مَنْ يَّقُوْلُ ہے' یہ کہے چلے جائیں گے لیکن وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8)۔ انفرادی طور پر تو میں نے اوپر مثال میں عرض کیا تھا کہ اپنی ایک چیز کو چھپا کر' کچھ بن کر' دوسری چیز لینے والا' وہی جو نان گریجویٹ تھا جس نے بی اے بن کر اسامی حاصل کر لی' وہ ملازمت کے سارے دورانیے میں کس جہنم میں گزرا۔ اور اجتماعی طور پر آپ دیکھ لیجیے کہ ہماری یہ مثال ہے۔ اس چیز کا دعویٰ ہے اور ایمانداری سے اس پر کوئی نہیں آ رہا۔ یہ نہیں ہے کہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس آیت کے معنی کس کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ چار ہی تو الفاظ ہیں۔ یہ کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پوری قوم بھگولے کے رقص کی طرح بپھری ہوئی ہے' کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کیا جائے۔ اس مشکل کے اندر پھنسی ہوئی ہے۔ غالب (1797-1869ء) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

(13) اگر کسی نے دنیا بھر میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار کرنا ہو تو اپنے قول و عمل میں تضاد پیدا کر لے

کہا ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا (4:145)۔ اپنی یہ حالت ہے اور یاد رکھو! جو بھی کسی اپنے قول و عمل میں مخلص نہیں ہے، دنیا میں اس کا کوئی مددگار نہیں ہوا کرتا۔ کیا بات کہہ گیا ہے قرآنِ پاک! بھکاری کی طرح خیرات کے ٹکڑے تو تمہاری جھولی میں کوئی ڈال دیں گے، وہ بھی اپنے مقاصد کی خاطر ہونگے۔ دوست کوئی نہیں ہوگا، مددگار کوئی نہیں ہوگا، ناصر کوئی نہیں ہوگا۔ (جواہر لال) نہرو (1889-1964ء) جیسے کافر نے یہ بات لوٹا کر کہہ دی تھی جب اس نے اس وقت کہا تھا جب آئے دن آپ کے ہاں حکومتیں بدلا کرتی تھیں۔ اس سے کہا تھا کہ جا کر Treaty (معاہدہ) کرو تو اس نے کہا تھا کہ کس کے ساتھ Treaty (معاہدہ) کروں۔ معلوم نہیں کہ وہ کل کہاں ہو، ان کے تو قول و فعل کا اعتبار نہیں ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا (4:145) ان کا کوئی رفیق اور مددگار نہیں ہوسکتا۔ اپنے کون ہو سکتے ہیں۔ سنیئے، عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے چار الفاظ میں بات کی ہے۔ کہا ہے کہ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا (4:146) اپنے وہ ہیں جو اپنی روش سے باز آ جائیں۔

(14) صحیح منزل پر پہنچنے کا طریق

پہلی چیز تو یہ ہے کہ تم نے اس دوراہے سے جو غلط قدم اٹھایا تھا تم وہاں لوٹ کر واپس آؤ۔ اسی راہ پر چلتے چلے جاؤ گے تو ہر قدم تمہیں منزل سے دور لیتا جائے گا۔ اس دوراہے کے اوپر واپس جاؤ جہاں سے تم نے غلط قدم اٹھایا تھا۔ کہو، اس بات کو تسلیم کرو کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔ یہی بنیاد ہے۔ وہاں واپس آ جاؤ۔ کیا اس دوراہے پہ واپس آنے سے منزل تک پہنچ جاؤ گے یہ کہہ کر کہ صاحب! چار گھنٹے کا سفر تھا، چار گھنٹے تو ہم نے چل لیا، بلکہ ہم نے تو آٹھ گھنٹے چل لیا، واپس بھی تو آئے ہیں۔ کہتا ہے کہ نہیں! یہ تو صرف غلطی کی تلافی ہوئی جو تم نے کی تھی۔ بات اب یہاں سے شروع ہوئی ہے۔ کہا ہے کہ وَاَصْلَحُوْا (4:146) آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کر لو۔ اب صحیح سمت کی طرف قدم اٹھاؤ۔ اس نفاق سے نہیں کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) ان میں سے جو چیزیں اپنے مفیدِ مطلب ہوئیں وہ لے لیں اور دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا۔

(15) مذہب کی افیون کا علاج دین کو مضبوطی سے اپنانے ہی میں ہے

کہا ہے کہ وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ (4:146) حبل اللہ کو محکمیت سے، مضبوطی سے تھامو۔ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ (4:146) اپنی اطاعت اور فرماں پذیری کو اپنے نظام سلطنت اور نظام حکومت کو، اپنے دین کو، خالص اللہ کے لیے کرو۔ یہ کرو گے تو فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ (4:146) پھر تم مومنین کی جماعت میں شامل ہو سکو گے۔ اور جب یہ ہوگا تو وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا (4:146) پھر تم دیکھو گے کہ اس اجرِ عظیم میں شریک ہو جائیں گے جو قانونِ خداوندی

کی رو سے عنقریب جماعتِ مومنین کو ملنے والا ہے۔ یہاں سَوْفَ ہے' یہ کوئی لمبی تاریخ یہاں نہیں پڑے گی کہ عاقبت میں ہی جا کر تمہیں کچھ ملے گا' کہا ہے کہ اس کے فوراً بعد تم دیکھو گے کہ اس کا کتنا بڑا اعظیم اجر ملتا ہے! یہ جو تم اس عذاب میں مبتلا ہو اور اس کے لیے پھر تمہیں یہ افیون پلا دی جاتی ہے کہ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ (29:21) اللہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ (48:14) جسے چاہتا ہے مغفرت کر دیتا ہے۔ پھر یہ وعظ ہوتا ہے کہ صاحب! یہ تو اللہ کی شان ہے جسے چاہے عذاب دیدے' جسے چاہے مغفرت کر دے:

اوتھے کی پروا اے راکب! اوتھے بے پروائیاں
پھڑ لے عملاں والیاں نوں' چھڈ دے او گنہار نوں

یہاں پہنچنے کے بعد یہ چیز ہے کہ قوم اگر ذلت اور عذاب کے اندر ہے تو اس میں کسی کا بس نہیں ہے بھئی! یہ تو یہ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ہے اللہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ (4:147) اگر تم اس طرح سے ایمان لاؤ اور اقدار کی قدردانیاں کرو تو ہم نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔

(16) دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونا ایک خطرناک نفسیاتی مرض ہے

سائیکولوجی میں ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے' اسے Sadism (اذیت پسندی) کہتے ہیں یعنی دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونا۔ یہ جتنے مستبد چنگیز اور ہلاکو اور یہ اس قسم کی شخصیتیں تاریخوں میں ملتی ہیں' ان کا Analysis (تجزیہ) یہ ہے کہ وہ Sadistic (اذیت پسند) تھے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونے کی اور اگر چنگیز اور ہلاکو کا قوت اور اختیار حاصل ہو جائے تو پھر تو آپ سمجھ لیجیے کہ وہ کیا کچھ کریں گے۔ وہ جو پہلے بادشاہوں کی باتیں سنتے ہیں کہ کوئی ان کے خلاف ہوا تو ٹھیک ہے بھئی! اس کو قتل کرا دیجیے' وہ یوں قتل نہیں کراتے تھے۔ جس جس عذاب سے اس کو قتل کراتے تھے وہ تھا کہ اندھے کنویں میں ڈالے ہوئے ہیں' بڑے بڑے چوہے وہاں چھوڑے ہوئے ہیں' بچھو اور سانپ چھوڑے ہوئے ہیں' بھوک سے بھی مار رہے ہیں' ہاتھیوں کے پاؤں تلے ان کو روندوایا جا رہا ہے' کھالیں کھنچوائی چلی جا رہی ہیں' الٹا لٹکوایا ہوا ہے۔ ایسے بادشاہ گزرے ہیں جو اپنا تخت اس جگہ بچھواتے تھے جہاں ارد گرد اندھے کنوؤں کے اندر ان دشمنوں کو ڈالا ہوتا تھا اور ان کی سسکیاں اور آہوں کی آوازیں آتی تھیں۔ جس دن یہ آوازیں کم ہو جاتی تھیں' اس دن داروغے کو حکم ہوتا تھا کہ یہ کیا ہوا' آج آوازیں کم آ رہی ہیں' اس کے اندر اس قسم کے لوگ نئے تازے ڈالو[1]۔ یہ ایک ذہنیت ہو جاتی ہے۔

عزیزانِ من! اب سوچئے کہ اگر یہ ذہنیت ہو تو میں تو ہلاکو اور چنگیز تک ہی رہتا ہوں کہ قوت وہ ہو' قوت ہو خدا کی اور معاذ اللہ معاذ اللہ ہو وہ کالی دیوی۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے ہاں کالی دیوی ہوتی ہے۔ اس کے گلے میں انسان کی

[1] آج بھی طاقتور قومیں اپنے مخالفین سے یہی سلوک کرتی ہیں صرف انداز مختلف ہے' ذہنیت تو وہی ہے۔

کھوپڑی کے ہار ہوتے ہیں۔ یہ ہوتی ہے Sadistic Mentality (اذیت پسند ذہنیت)۔ ان کی نفسیات میں یہ کیفیت تھی کہ ان کے ورن کا ہندو، نیچے ورن کے ہندو کو دبا کے، گلا گھونٹ کے، خوش ہوتا تھا، ان کا خدا جو تھا وہ کالی دیوی ہوتا تھا، کالی بھیرو ہوتا تھا۔ یہاں تو اب نہیں ہیں، پتہ نہیں، انڈیا میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ سرخ رنگ کی اس کی زبان نکلی ہوئی ہوتی تھی، اس کی بھیانک ڈائن جیسی شکل ہوئی تھی، اس کے چار پانچ ہاتھ ہوتے تھے اور گلے میں انسانوں کی کھوپڑیوں کا ہار یا وہ انسان کی لاش کے اوپر کھڑی ہوئی ہیں اور ان کے ہاتھ میں کنڈی سی تھی، اس میں اس کو چبھویا ہوا ہے، خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں، دیوی یا دیوتا خوش ہو رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ہو نفسیاتی کیفیت، کسی کی Mentality (ذہنیت) کی اور قوت اور اقتدار ہو لامنتہا، تو توبہ توبہ ہی بھلی!

(17) اللہ تعالیٰ کی کبریائی تو ان تصورات سے کہیں بلند ہے

خدا کے صحیح تصور کے بارے میں کہا ہے کہ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ (4:147) تم اگر ان چیزوں کی قدردانی کرو جو ہم نے تم سے کہی ہیں تو ہم نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔ آہاہا! یہ بڑی عجیب چیز ہے! یہ ہے وہ خدا۔ کہا ہے کہ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ (4:147)۔ یہ کچھ کہنے کا کتنا حسین انداز ہے! اوسو چو تو سہی، تمہیں تکلیف پہنچا کر ہمیں کرنا کیا ہے مگر یہاں تو مرے کو مارے شاہ مدار۔ سچ یہ ہے کہ جو خود ہی مر رہا ہے اس کو اگر مارا تو کیا مارا۔ کہا ہے کہ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (4:147) صحیح اقدار حیات پہ ایمان لاؤ اور اس کے لیے بھرپور کوششیں کرو۔ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (4:147) تم شکر گزار بنو تو ہم تمہارے لیے شاکر بنیں گے۔ کیا بات ہے!

(18) دوسروں کے سابقہ Career (پیشے، کام) کو معاشرے میں مت پیش کرو:

اب آگے ایک اور بات آئی۔ یہ منافقین کا ذکر آ رہا تھا، ان سے کہا تھا کہ اگر یہ اپنی روش چھوڑ کر یہ کچھ باتیں اختیار کر لیں تو پھر تمہیں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اس کے بعد ان کا جو Past Career (عہد ماضی کا پیشہ، کام) ہے، اس کے متعلق تشہیر کرتے پھرو کہ ہاں! ہمیں وہ دن یاد ہیں، ان کی کیفیت یہ تھی، یہ لوگ ایسے تھے۔ کہا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ (4:148) ہم قطعاً اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ تم ان چیزوں کا چرچا کرتے پھرو۔ اور انہی کے متعلق نہیں، خود معاشرے کے متعلق بھی یہ چیز کہو کہ انفرادی طور پہ کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ جس چیز کو ناپسند سمجھتا ہو اس کے متعلق Demonstration (مظاہرہ) شروع کر دے۔ دہائی دینا شروع کر دے، نہیں، ہم قطعاً اسے پسند نہیں کرتے۔

(19) اپنی پسند کو دوسروں سے باور نہ کروانے کی شکل میں انہیں بدنام نہ کیا جائے

یہ ٹھیک ہے کہ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (4:148) ہاں، البتہ جس پر ظلم ہوا ہو، وہ ظلم کی تو فریاد کر سکتا ہے لیکن اگر اس پر ظلم نہیں ہوا ہے، کوئی بات ہے، جو اسے ناپسند ہے تو یہ بات غلط ہے کہ تم دوسروں کے خلاف ان کی تشہیر کرتے پھرو۔ معاشرے کے

اندر تو قرآنِ کریم نے خاص احتیاتی تدابیر اختیار کرنے کو کہا ہے۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے کہا ہے کہ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ (4:83) معاشرے میں فتنہ پروری کی ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا مقصد اور منصب یہ رہ جاتا ہے کہ کسی طرح معاشرے میں خلفشار پیدا کرتے چلے جائیں' انتشار پیدا کرتے چلے جائیں' فساد برپا کرتے چلے جائیں' نہ کسی کو سکون سے بیٹھنے دیں' نہ کسی کو معاشرے میں چین سے بیٹھنے دیں۔ ان کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے۔

(20) بغیر تصدیق کیے کسی کی بات کو آگے مت پھیلاؤ

عزیزانِ من! ان کی کیفیت یہ ہے کہ جونہی کوئی بات' کہیں سے' پہنچی تو انہوں نے دہائی دینا شروع کر دی۔ کہا کہ ہوسکتا ہے کہ فی الواقعہ وہ بات صحیح ہو' اس کے نتائج وعواقب معاشرے کے لیے بڑے ہی نقصان رساں ہوں۔ ہاں! وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (4:83) کرو یہ کہ اگر کوئی ایسی بات آئے تو جو اربابِ اختیار واقتدار ہیں' جو ذمہ دار لوگ ہیں' ان تک جا کر رپورٹ کرو تا کہ وہ تحقیق کر لیں' پھر کسی صحیح نتیجے پہ پہنچیں' اس کے مطابق مناسب اقدامات کریں۔ کہا کہ یہ طریقہ ہونا چاہیے۔ اب یہاں تو یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ ''اک پَر دیاں ڈاراں بنا ندے ہیگے نیں'' (ایک ہی پَر کو بڑھا چڑھا کر پرندوں کا غول بنا دیتے ہیں) یعنی کسی چڑیا کو دیکھا' کہا کہ وہ ڈار ہوتی ہے۔ وہ جھنڈ کے جھنڈ پرندے بناتے ہیں' ذرا سی چیز ہوتی ہے وہ اسے اتنا بڑا ابھار دیتے ہیں۔ ہم اس مقام پہ پہنچ گئے ہیں کہ ''پروی نئیں ہوندا' تے ڈاراں بنن دیاں ہویاں ہوندیاں نیں'' (ایک پر بھی وہاں نہیں ہوتا مگر ان کے نزدیک غول کے غول بن رہے ہوتے ہیں)۔ کل ہی آپ نے یہ تماشا دیکھا جو ہمارے ہاں ہوا تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ حضور ذات رسالت مآب ﷺ کی ذات اقدس واعظم ﷺ اتنی بلند ہے کہ حضور ﷺ کی تعظیم وتکریم واحترام کے لیے تو اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہے گا کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' حضور ﷺ کی ذات اقدس میں کسی قسم کی جو اہانت وگستاخی ہے' وہ کبھی مومن برداشت نہیں کر سکتا لیکن یہ بھی تو خدا کا حکم ہے کہ اگر کوئی ایسی چیز آئے تو اس کے متعلق' جو ذمہ دار ارباب ہیں' ان تک وہ بات پہنچائیے' وہ مناسب تحقیق کریں' وہ پھر اقدامات کریں جو کچھ کرنا ہے۔ اور اگر کیفیت یہ ہو جائے کہ جس کا جی چاہے وہ اس چیز کو لے اڑے اور پھر تخریبات کی یہ کیفیت ہو کہ توڑ پھوڑ کرو' آگ لگاؤ' یہ کرو وہ کرو۔ اس طرح معاشرے میں کبھی امن قائم نہیں رہ سکتا۔

عزیزانِ من! یہ سارا کچھ ہونے کے بعد' کل کے اخبار میں جو نکلا ہے وہ آپ احباب نے پڑھا ہوگا۔ وہ ایک ''کتاب'' ہے جس کے متعلق ساری دہائی دی گئی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کوئی چار سو سال ہوئے' ترکی میں ایک شخص تھا' اس نے یہ کتاب لکھی تھی' وہ اسی زمانے میں مر بھی گیا' اور یہاں یہ ہو رہا تھا کہ کوئی کہتا تھا کہ مصنف انڈین نیشنل ہے' کوئی کہتا تھا کہ برٹش نیشنل ہے' اس کو پکڑو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کے متعلق کہیں سے گستاخی کا کلمہ سننے سے ہمارا دل تڑپ کیوں نہ اٹھے لیکن دل کی تڑپ کے یہ معنی نہیں کہ ہم خود خنجر ہاتھ میں لے لیں۔ قرآنِ حکیم یہ کہتا ہے کہ جب کبھی

ایسی بات ہو تو اسے ذمہ دار احباب تک پہنچایئے' وہ بھی تو وہی ہیں جن کے سینوں میں وہی دل ہے جو اس بات پہ ہم سے بھی زیادہ تڑپ اٹھے گا لیکن اس سے جو کیا جائے گا اس سے معاشرے کا نظام نہیں بگڑے گا اور جو اقدام کیا جائے گا وہ Effective (مؤثر و کارآمد) ہوگا۔ اور اگر یہ نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنا معاشرہ تو تباہ ہو جاتا ہے اور وہ جو اصل مقصد ہوتا ہے وہ اس کے بعد مفقود ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تو ہمیں اس کی تلقین کی ہے۔

عزیزانِ من! دوسری جگہ ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا (49:6) جب بھی کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو یونہی اس کے پیچھے نہ جاؤ' اس کی چھان بین کرو۔ اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (49:6) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم یونہی اٹھ کر جذبات میں یہ فساد انگیزیاں شروع کر دو' اپنی تباہیاں کر لو اور اس کے بعد افسوس ہو کہ ہم نے یہ کیا کر دیا۔ اسی ضمن میں قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا (4:148) خدا یہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ جو چیز تمہیں ناپسند ہو' ناگوار گزرے' تم اس کی تشہیر شروع کر دو' دہائی دینی شروع کر دو' Demonstration (مظاہرہ) شروع کر دو' فساد برپا کرو۔ نہیں' قطعاً ایسا نہیں کرو۔ جس پہ ظلم ہوا ہے' وہ اپنے ظلم کی فریاد کرے اور اگر اس قسم کی کوئی خبر پہنچی ہے تو ذمہ دار ارباب تک پہنچایئے۔ ان کا کام ہے کہ وہ دیکھیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ آگے کہا ہے کہ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا (4:148) یہ جو اللہ ہے' جس کے نام پہ حکومت قائم ہوتی ہے' اس کے یہ فرائض ہو جاتے ہیں' وہ حکومت سمیع و علیم ہوتی ہے' صحیح تہ تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس بہت سے ذرائع ہوتے ہیں' انہیں صحیح تہہ تک پہنچنے دو۔ باقی رہا یہ کہ کسی کے متعلق جو اچھی بات ہے' ٹھیک ہے کہ اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ (4:149) اس کا تم چرچا بھی کر سکتے ہو' اس کو تم ویسے بھی رہنے دے سکتے ہو لیکن جو چیز معاشرے میں فساد کا موجب بنتی ہے' تم اس کا چرچا نہیں کر سکتے۔ یہ بھی چیز ہے کہ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ (4:149) کبھی کوئی برائی تمہارے خلاف ہوئی ہے' اسے درگزر کر کے تم آگے بھی بڑھ سکتے ہو۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا (4:149) یاد رکھو! خدا میں دونوں چیزیں موجود ہیں' وہ قدیر بھی ہے کہ اس نے اس کے لیے قانون بھی بنا رکھا ہے' وہ عَفُوًّا (4:149) بھی ہے کہ اگر وہ دیکھتا ہے کہ یونہی اصلاح ہو سکتی ہے تو پھر وہ یونہی آگے بڑھ جاتا ہے۔

(21) لفظ عَفُوًّا کا لغوی اور قرآنی مفہوم ''درگزر کرنا'' ہے اور بابا جی دی اللہ میاں نال چلدی اے ذرا

یہ عَفُوًّا عجیب لفظ ہے' اسے ہم معافی کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں ''کسی بات سے آگے بڑھ جانا' جسے درگزر کہتے ہیں''۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارے نظام میں یہ دونوں چیزیں ہونگی کہ اگر وہ ایسی فتنے کی صورت نہیں ہے اور اس میں اصلاح کا امکان ہے تو اس میں وہ معاف کر دے گی' اگر ایسی صورت نہیں ہے تو قانون کے شکنجے میں لے آئے گی لیکن انفرادی طور پہ' تم اس طرح سے Law (قانون) کو اپنے ہاتھ میں مت لو۔ یہاں وہ بات آئی ہے۔ یہ منافق یا کافر کی بڑی اہم چیز

آئی ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ (4:150) جولوگ خدا اوراس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں یا خدا کو تو مانتے ہیں کہ کارگہ کائنات میں اس کے قوانین جاری وساری ہیں لیکن جہاں تک انسانوں کی دنیا کا تعلق ہے وہ اس قانون سے انکار کرتے ہیں یا اس کے قانون کو مانتے ہیں تو اس طرح کہ کسی ایک رسول کی طرف نازل شدہ قانون کے من جانب اللہ ہونے کو تسلیم کیا اور دوسروں کی تکذیب کر کے اللہ اور اس کے رسول میں تفریق پیدا کی اور اس طرح یہ صرف ''اللہ اور رسول'' پر ایمان ہے۔ یہ قرآن حمید کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے۔

عزیزانِ من! جب جھکڑ آتا ہے تو انسان کپڑوں کو اپنے ساتھ سمیٹ لیتا ہے۔ جب خاموشی سے حرارت آتی ہے تو خود انہیں اتار کر رکھ دیتا ہے۔ معاشرے میں جھکڑ نہیں پیدا کرنے چاہئیں' سورج کی سی خاموش حرارت پیدا کرنی چاہیے۔ مثلاً ''ان'' کا یہ مکالمہ سنیے۔ صبح اتنی ٹھنڈ تھی' ہم نے وہ سائبان نہیں لگایا' انہوں نے کہا کہ بابا جی! بارش نہیں ہو رہی ''فصلاں سُک گیاں حال برا ہو ریا اے'' (فصلیں خشک ہوگئیں' بُرا حال ہو رہا ہے)۔ ''کہن لگے اچھا! اے ساڈی جھُلی جیہڑی ہیگی اے کل دھوتی سی' ایہنوں باہر دھپے پا دیو' (کہنے لگے کہ اچھا! یہ جو ہماری گدڑی ہے' اسے کل دھویا تھا اسے خشک ہونے کے لیے دھوپ میں ڈال دو)۔ ''کہن لگے: پتہ نئیں باہر دھپے اوہدے نال کی تعلق اے' آیا بدل' کڑاکڑ مینہ وسنا شروع ہویا' اوہناں نے کہیا کہ بابا جی! ایہدے اچ کی راز اے؟ کہن لگے: آج کل ساڈی اللہ میاں نال چلدی اے ذرا[1]''۔ یہ اندازوں کی غلطی ہے' عزیزانِ من! اس کے ہاں تو ہر چیز قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

(22) انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ قوانینِ فطرت کو تو مانتا ہے لیکن وحی کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات کو تسلیم نہیں کرتا

کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ (4:150)۔ عزیزانِ من! میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بڑی اہم چیز آئی ہے۔ قرآنِ کریم میں کئی مقامات پہ یہ ہے کہ جب ان سے پوچھو کہ زمین وآسمان کو کس نے بنایا ہے تو کہیں گے کہ خدا نے بنایا۔ ان سے کہو کہ اس خارجی کائنات کے نظام پر کس کی قدرت ہے' سورج کون چڑھاتا ہے' ہوائیں کون چلاتا ہے؟ کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا کرتا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ یہاں تک تو تم خدا کو مانتے ہو اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کی دنیا میں خدا کے قوانین کو مانو تو اس کے بعد کہا ہے کہ فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ (43:87) ''تہانوں فیر کی موت پے جاندی اے ایتھے آ کے'' (یہاں آ کر پھر تمہیں کونسی موت پڑ جاتی ہے)۔ یہ ہے خدا کا ماننا۔ عزیزانِ من! اگر خدا کے قانون کو نہیں ماننا ہے تو خدا پہ ایمان لانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ وہ دہریہ جو بالکل ہی نہیں مانتا' وہ بھی قوانینِ فطرت کو مانتا

---

[1] کہنے لگے: معلوم نہیں کہ باہر دھوپ میں' اس کا' اُس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ بادل آیا کڑاکے دار' بارش برسنا شروع ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ بابا جی! اس میں یہ کیا راز ہے؟ کہنے لگے: آج کل ہماری اللہ میاں سے لگی ہوئی ہے' اللہ میاں سے چل رہی ہے۔

ہے اور یورپ کا مادہ پرست تو ہم سے بھی زیادہ خدا کو مانتا ہے' وہ تو ان قوانین کی صداقت پر اس طرح سے علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتا ہے' اس چیز کا روز مشاہدہ کرتا ہے' نام چاہے کچھ اور رکھ لے۔ اور جو اس طرح سے وہاں انکار نہیں کرتے وہ سب خدا کو مانتے ہیں' بڑے بڑے سائنٹسٹ کی کم از کم آخری عمر کی کتابوں کو دیکھیے' وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے تجربات کی بنا پر خدا کو مانتے ہیں۔ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) کونسی بات ہے جس کی وجہ سے وہ خدا کو ماننے والے نہیں کہلا سکتے۔ خدا کے ماننے کے معنی یہ ہیں کہ میری جو زندگی ہے' وہ خدا کے قوانین کے تابع چلے گی' خدا کا ماننا خدا کے قوانین کو ماننا ہے۔

(23) خدا کے ماننے یا نہ ماننے کا تمام تر دارومدار حیات انسانی کے لیے دی گئی راہنمائی پر ایمان لانے پر موقوف ہے

اور یہ قوانینِ خداوندی انسانوں کے ذہن کے پیدا کردہ نہیں ہیں' وہ رسول ﷺ کی وساطت سے ملتے ہیں اس لیے رسول ﷺ پہ ایمان نہیں لایا جاتا تو خدا پر ایمان بے معنی ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم یہود اور نصاریٰ اور ان تمام لوگوں کو جو خدا کو مانتے تھے' اپنے اپنے نبیوں کو بھی مانتے تھے' کیوں تاکید کر رہا ہے کہ تمہیں اس رسول ﷺ پر ایمان لانا ہوگا اور اس کتاب پر ایمان لانا ہوگا۔ اس لیے کہ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جو ضابطۂ حیات دیا ہے' اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے ورنہ یونہی خارجی کائنات کے اندر آسمان پر بیٹھے ہوئے خدا کی کارفرمائی کو مان لینا' نہ مان لینا' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ایک کہتا ہے کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں! یہ خود وجود میں آ گئی۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ فرق یہ پڑتا ہے کہ ایک کہتا ہے کہ میری زندگی' میرے فیصلوں کے تابع چلے گی بلکہ یوں کہیے کہ میرے فیصلوں نہیں' پارلیمنٹ کے فیصلوں کے تابع چلے گی' قوم کے' عوام کے' فیصلوں کے تابع چلے گی اور اس کے باوجود جا کر مسجد میں نماز بھی پڑھتا ہے' یہ خدا پہ ایمان نہیں ہے۔ ایمان وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ میری ساری زندگی خدا کے دیئے ہوئے قوانین کے تابع چلے گی' یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ملے گی۔ یہ ہے خدا پر ایمان۔

(24) برہموسماجی طریق کا پروگرام اور اس کا نتیجہ

مختلف مذاہب کے باہمی سر پھٹول کو دیکھ کر ہمارے ہاں برہموسماجی [1] ایک فرقہ پیدا ہوا تھا اس کا بانی راجہ رام موہن رائے تھا۔ اس نے یہ بات کہی تھی کہ صاحب! یہ سب چیزیں اس لیے ہو رہی ہیں کہ تم الگ الگ مذاہب رکھے ہوئے ہو۔ اس نے کہا تھا کہ تمام مذاہب کی اچھی اچھی باتوں کو اکٹھا کر لیا جائے۔ گویا یہ کہ مذاہب میں اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں' بری بھی ہوتی ہیں۔ مذاہب میں تو یہ ہوتا ہی ہے اس لیے کہ وہاں تو خدا کے پیغامات میں تحریف ہو چکی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمام مذاہب کی اچھی اچھی باتوں کو جمع کر لیا جائے اور اس کو اپنے لیے ضابطہ بنا لیا جائے' باقی رہا خدا سے تعلق تو کسی نے مندر میں

[1] ہندوؤں کا مکتبۂ فکر جس کی بنیاد 1830ء میں راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں رکھی تھی۔

گھنٹی بجالی تو کیا' کسی نے گرجے میں بل (Bell) بجالی تو کیا' کسی نے اذان دے لی تو کیا۔ یہ بات تو ذاتی خدا سے تعلق کی ہے۔ اچھی اچھی باتیں اکٹھی کر لی جائیں۔ اس کا بڑا چرچا ہوا کہ صاحب! یہ بہت اچھا ہے۔ یہ چار دن بھی نہیں چل سکا اور یہ بات صاف ہے۔ ہم کم از کم جتنے مسلمان ہیں یا دنیا بھر کے جتنے بھی صاحب شعور لوگ ہیں' ان میں یہ جتنے بھی جنہیں ہم Universal Moral Laws (عالمگیر ضابطۂ قوانین) کہتے ہیں' آپ عالمگیر ضابطۂ اخلاق کہتے ہیں مثلاً سچ بولو' جھوٹ نہ بولو' فریب نہ دو' چوری نہ کرو' زنا نہ کرو' کسی کو نہ ستاؤ' یہ ساری دنیا میں Common (مشترک) ہیں۔ اس کے باوجود ساری دنیا میں یہ ہو کیا رہا ہے؟ یہ اس چیز پہ ایمان نہیں ہے کہ یہ چیزیں مستقل اقدار ہیں جن کے تابع زندگی بسر کرنا میرا ایمان ہے۔

(25) قرآنی ضابطۂ حیات پر ایمان زندگی کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کرتا

عزیزانِ من! اسے ایمان بالرسالت کہتے ہیں جس میں خدا کی کتاب پہ ایمان شامل ہوتا ہے۔ خدا کو ایک Personal God (تجسیمی خدا) مان لینا' اس کے ساتھ میرا ذاتی تعلق ہے اور جو اعمال حیات ہیں ان کو اپنے قانون کے تابع' اپنی مرضی کے تابع' ملک کے قانون کے تابع' رکھ لینا' یہ خدا پہ ایمان نہیں ہے' یہ تفریق بین اللہ و بین الرسل ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم اللہ میں اور اس کے رسولوں میں تفریق کرتے ہو حالانکہ جس کو رَسُوْلَہٗ کہا ہے' خدا کا پیغامبر کہا ہے تو پیغام بھیجنے والے میں اور اس پیغام میں فرق کرنا یعنی وہ جو بھیجنے والا ہے' اس کو آپ نے مانا کیا ہے؟ اس کے ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پیغام کو' پیغام لانے والے کو' مانیئے۔ یہ اس طرح کا Personal God (شخصی سا خدا) ہے' یہ اس کا تصور ہی وہاں پیدا ہوا تھا جب سیکولر نظام حکومت اپنے ہاں رائج کیا کہ جو Personal (شخصی) معاملات ہیں ان کے اندر تو تم جانو' تمہارا خدا جانے اور دوسری طرف جتنے بھی امور دنیاوی ہیں' جو امور مملکت ہیں وہ ہمارے اپنے باہمی مشورے سے طے ہونگے اور اس کا انہوں نے نام رکھا ہے خدا پر ایمان۔

(26) تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں مخالفت کرنے والے علما کے متعلق علامہ اقبالؒ کا ارشاد

وہاں انڈیا کے اندر یہی چیز تھی جو پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں میں اور اس کی مخالفت کرنے والے مسلمان علما میں مابہ النزاع تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں ہندوستان میں مذہب کے عقائد کی' رسومات کی' عبادات کی' اجازت ہے مگر جو ملکی قوانین ہیں وہ ملک کے ہونگے۔ اس کہنے والے (اقبالؒ) نے اس کے خلاف کہا تھا کہ

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ اللہ اور رسول ﷺ کے اندر تفریق تھی۔ مسلمانوں کے معاشرے کے اندر بھی جو لوگ تھے وہ اس کی جرأت تو نہیں کرتے کہ وہ اعلانیہ یہ کہہ دیں کہ خدا سے ہمارا کوئی تعلق نہیں' ہم نہیں مانتے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ معاشرے کے اندر

رہتے ہوئے یہ کہنے کی بڑی جرأت ہے۔ یہ جرأت یہاں کس کو نصیب ہے۔ یہاں وہ لوگ موجود ہیں جو فی الواقعہ خدا کے ان قوانین کے تابع' قرآنِ کریم کے تابع' نہیں رہنا چاہتے' وہ قرآنِ حکیم کو مانتے ہی نہیں ہیں کہ یہ بھی کوئی وحی کی چیز ہے' اس میں ابدی حقائق ہیں' ابدی قوانین ہیں' اس پر ان کا ایمان نہیں ہے مگر ان کی دشواری یہ ہے کہ نہ کر نہیں سکتے۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ خدا پرستی کی شہادتیں کس طرح سے دیتے ہیں؟ عُرسوں پہ چلے جائیں گے' داتا صاحب کے مزار پہ چلے جائیں گے' بلھے شاہ کے ملنگ بن جائیں گے۔ یہ سارا کچھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ معاشرے کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم دہریئے نہیں ہیں۔ لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے کہ وہ تو عقیدت مندی کی بڑی انتہا ہوتی ہے جو ان قبروں پہ چلا جاتا ہے' وہاں چلا جاتا ہے۔ یہی فرار (Escapism) تو تصوف ہے۔ نظامِ دنیا کو چھوڑ دینا کہ جس قسم کے جی چاہے یہاں قوانین نافذ ہوتے رہیں' اپنا تعلق خدا کے ساتھ یوں وابستہ کر لینا۔

کہا ہے کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (2:9)۔ یورپ کا ہر بڑا سائنٹسٹ جو خارجی دنیا میں خدا کو مانتا چلا جا رہا تھا' آپ دیکھیں گے کہ آخر میں آ کر ان میں سے ہر ایک اس کا نسچت (منکر) ہو گیا۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ ہے خدا کو ماننے کا عملی ثبوت۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ لوگ جن کی عام زندگیاں ہر قسم کے عیوب میں' ہر قسم کے معائب میں ہوتی ہیں' جو قانون شکنیوں کے اندر ہوتے ہیں' جو اسمگلر ہوتے ہیں' جو جوئے باز ہوتے ہیں' وہ سب سے زیادہ قبروں پہ جانے والے ہوتے ہیں' وہ اس طرح خدا پر اپنے ایمان کا ثبوت دے رہے ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ میں تفریق کفر ہے۔

عزیزانِ من! کیا کہنے ہیں اس کتاب کے! یہ تو کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑتی۔ اللہ اور رسول ﷺ کا ماننا کیا ہے؟ رسول ﷺ کے ذریعے جو پیغام ملا ہے' اس کو زندگی کا عملی ضابطۂ حیات قرار دینا ہے۔ یہ ہے اللہ پر ایمان۔ جب اس نے کہا تھا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (2:8) وہ لوگ ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے لیکن وہ درحقیقت ان پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ یہ لوگ تھے جو اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ (4:150) بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ فرق کرتے ہیں اور اس طرح اقرار اور انکار کے بین بین ایک تیسری راہ اختیار کرنے کی سوچتے ہیں۔

(27) ہر امت رسول کی نسبت سے تشکیل پاتی ہے

اب آگے اس میں دو تین باتیں کہی ہیں' کہیں تو یہ صورت ہے کہ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ (4:150) ان رسولوں میں سے جو آتے رہے' ان میں سے بعض پر کہتے ہیں ہم ایمان لائے' بعض کو کہتے ہیں کہ ہم انکار کرتے ہیں۔ یہودی حضرت عیسیٰؑ سے پہلے تک کے نبیوں پہ ایمان لانے کے لیے مطمئن ہے' یہودی' عیسائی ہو جاتا ہے جب وہ حضرت عیسیٰؑ پہ بھی ایمان لے آتا ہے۔ وہاں پھر وہ مطمئن ہو گیا۔ ٹھیک ہے' وہاں تک تو ٹھیک تھا' اس کے بعد نبی اکرم ﷺ تشریف لے آئے۔ نبی اکرم ﷺ سے انکار مگر پہلے تمام انبیاء پر ایسے اقرار کو قرآنِ کریم اقرار نہیں مانتا۔

(28) ختم نبوت کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے

یہاں سے ضمناً ایک اور بات سامنے آ گئی۔ بڑا آسان مسئلہ ہے کہ جو روز ہمیں درپیش ہوتا ہے کہ آیا یہ مرزائی مسلمان ہیں یا نہیں' یہ امت محمد ﷺ کے افراد ہیں یا ان کو الگ امت کے افراد قرار دیا جائے؟ یہ بڑی آسان سی بات ہے۔ امت بنتی کس طرح سے ہے؟ ایک یہودی حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے تمام نبیوں کو مانتا ہے' وہ موسوی امت کا قائل ہے' حضرت موسیٰؑ کو اپنا نبی مانتا ہے' جس دن وہ حضرت عیسیٰؑ کو نبی مان لیتا ہے' وہ عیسائی ہو جاتا ہے' یہودی نہیں رہتا' اس آخری نبی جس کو اس نے مانا ہے' اس پہ ایمان لانے سے اس نبی کی امت کا فرد ہو جاتا ہے۔ عیسائی' عیسائی رہتا ہے جب تک رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لاتا' جس دن وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آتا ہے وہ عیسائی نہیں رہتا' مسلمان ہو جاتا ہے یعنی وہ اب امت عیسوی کا فرد نہیں رہا' امت محمدیہ ﷺ کا فرد ہو گیا۔ یاد رکھو! رسول کی نسبت سے امت بنتی ہے۔ اور اگر رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور نبی پر ایمان لے آیا تو جس طرح عیسائی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے عیسائی نہیں رہتا اسی طرح مسلمان آپ ﷺ کے بعد کسی نبی پہ ایمان لانے سے' آپ ﷺ کی امت میں تو نہ رہا بلکہ اس نئے نبی کی امت میں سے ہو گیا۔ بات تو صاف ہے کہ جی! ہم رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں' قرآنِ کریم کو مانتے ہیں۔ یہ ہے بنیاد۔ اور جب تک کوئی اس رسول کی امت کا فرد نہیں ہوتا تو اس کے لیے خدا پر ایمان لانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عزیزانِ من! یہ فریب ہے' فرار ہے' گریز ہے' قرآنِ حکیم اسے کفر کہتا ہے۔ کہا ہے کہ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ (4:150) وہ کہتے ہیں کہ ہم ضابطۂ قوانین کی ایک بات پر ایمان لاتے ہیں اور دوسری سے انکار کرتے ہیں۔ پھر یہ ایک ہی رسول یا ایک ہی رسول کی کتاب میں سے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے انکار ہے۔

(29) مسلمان ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کو من حیث الکل تسلیم کیا جائے

قرآنِ حکیم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) کیا اس کتاب کی بھی تم یہ کیفیت کرتے ہو کہ اس کے کچھ حصے پر ایمان لے آؤ اور کچھ حصے سے انکار کر دو یعنی اسے بھی آپ کو من حیث الکل لینا ہوگا۔ کچھ حصہ تو ایک طرف اگر آپ پاکستان کے ضابطۂ قوانین میں سے کسی ایک کے متعلق یہ کہہ دیں کہ میں اس سے سرکشی (یعنی جرم اور چیز ہے کہ اس کی خلاف ورزی آپ سے ہو جائے) اختیار کرتا ہوں' اگر آپ یہ کہیں کہ میں اس حکومت کو اس کا Competent (مجاز) نہیں مانتا کہ وہ اس قسم کا قانون بنا سکے اور نافذ کر سکے تو یہ بغاوت ہے۔

آپ اس مملکت کے نیشنل (شہری) نہیں رہ سکتے جس کے قانون کے متعلق آپ یہ چیلنج کر دیں کہ اس باب میں یہ میری مملکت نہیں رہی۔ اس لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ کیا کرتے ہو کہ ضابطۂ قوانین کے ایک حصے پہ ایمان لاتے ہو' اور

دوسرے سے انکار کرتے ہو۔ کہا ہے کہ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ (2:85) ایسی روش اختیار کرنے والے جو دوغلے ہیں' ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت وخواری ہوگی' عاقبت کا عذاب تو اس سے کہیں زیادہ شدید ہوگا۔ ضابطۂ حیات کو توکلی ماننا ہوگا یا کلی انکار ہوگا۔ کہا ہے کہ ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً (2:208) پورے کا پورا اس میں داخل ہونا ہوگا۔ منافق یہ کرتے ہیں کہ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَكۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا (4:150) بین بین کی راہ اختیار کی جائے 'نہ تو پورے کا پورا انکار کیا جائے' نہ پورے کا پورا اقرار کیا جائے۔ صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں۔ عزیزانِ من ! یہ جو چلمنی پردہ ہے یہ منافقت ہے' اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یہاں Percentage (فی صد) کا حساب نہیں ہے کہ کوئی نہیں صاحب! 33% تو حاصل کر لیے' پاس مارکس ہو گئے۔

یہاں تو ہر Subject Compulsory (مضمون لازمی) ہے۔ سارے Optional (اختیاری مضامین) سے آپ 100% مارکس لے کر ایک Compulsory Subject (لازمی مضمون) میں' ایک نمبر سے فیل ہو جایئے' آپ پورے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے ضابطۂ ہدایت کا ہر مضمون Compulsory (لازمی) ہے۔

(30) صراط مستقیم کو چھوڑ کر بین بین راستے پر چلنے والا مسافر کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتا

کہا ہے کہ اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا (4:150) بین بین کی راہ اختیار کرتے ہو۔ سنیے! عزیزانِ من! کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ حَقًّا (4:151) خدا کو مان رہے ہیں' بعض رسولوں کو بھی مان رہے ہیں' کچھ حصہ جو ہے اس پہ ایمان بھی ہے' کچھ حصے پر کچھ عمل بھی ہے' باقی ماندہ کو چھوڑ دیا ہوا ہے۔ میں نے جیسا کہا تھا کہ ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ چلیے بہرحال اتنے Percent (فی صد) مارکس تو مل ہی جائیں گے۔ وہ کافر ہی نہیں کہہ رہا ہے بلکہ کہہ رہا ہے کہ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ حَقًّا (4:151)۔ اس میں فریب کی گنجائش تھی اس نے فریب کو توڑنے کے لیے یہ حَقًّا کہہ کر ''ایہڈ اوڈا ودان ماردتا اے۔ تہاڈی ایسی دی تیسی'' (اتنا بڑا ہتھوڑا مار دیا ہے۔ تمہیں ملامت کر دیا ہے)۔ کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا (4:151) اس قسم کی روش اختیار کرنے والے جو کافر ہیں' ان پہ جو عذاب آتا ہے' وہ رسوا کن ذلت آمیز ہوتا ہے۔ یہاں عذاب مھین کہنا کیا بات ہے صاحب! ذلت اور وہ بھی منافقت کی ذلت کا کیا پوچھنا ہے! کہا ہے کہ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمۡ يُفَرِّقُوۡا بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ اُولٰٓئِكَ سَوۡفَ يُؤۡتِيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا (4:152) ان کے برعکس وہ لوگ جو خدا پر یوں ایمان لاتے ہیں کہ خدا اور اس کے پیغام رسانوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ رسول اور اس کی رسالت' اس کے پیغامات پر ایمان لانا' یہ ہے خدا پہ ایمان لانا' وہ اس میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ ہیں جنہیں تم دیکھو گے کہ بہت جلد ان کی محنتوں کا معاوضہ دیا جائے گا۔ معاوضہ یوں ہوگا کہ

ان کی کچھ کمزوریوں، کچھ کوتاہیوں کی حفاظت بھی ہوجائے گی، سامان نشوونما بھی ملتا جائے گا، قوم آگے بڑھتی چلی جائے گی۔

(31) ایمان کی منزل تک پہنچنے کا طریق اور ایمان کے سلسلہ میں اکراہ کا مفہوم

اب یہ رہا کہ ایمان کیسے لایا جائے۔ قرآنِ کریم نے یہ چیز بتائی ہے کہ ایمان کے معنی ہیں ''قلب اور دماغ کو امن نصیب ہوجانا، کامل اطمینان ہوجانا، علیٰ وجہ البصیرت کسی چیز پہ غور وفکر کرنا، اور اس طرح سے اس نتیجے پہ پہنچنا کہ یہ واقعی حق ہے، اس کا نام ہے ایمان''۔ اس میں کسی قسم کا اکراہ نہیں ہے۔ اکراہ وہ ہے جسے ہم زبردستی کہتے ہیں۔ ذہن میں اکراہ ایک ہی آتا ہے کہ کسی نے ہاتھ میں تلوار لی اور کہا کہ پڑھو کلمہ اور اس کے اس تلوار کے ڈر سے جو کلمہ پڑھ لیا، اسے کہتے ہیں کہ اکراہ ہوا یعنی کسی سے زبردستی کرالیا۔ یہ تو اکراہ کی بڑی معمولی سی چیز ہے۔

برادرانِ عزیز! اکراہ وہ ہے کہ آپ کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کرکے، آپ سے کوئی بات منوالی جائے اور پھر ایسا چکر رکھا جائے کہ آپ اس سے نکلنے ہی نہ پائیں۔ یہ ہے صحیح اکراہ۔ یہ وہ اکراہ ہے جس کا تعلق قلب ودماغ سے ہے۔ یہاں سے بہت کم نکلا جاسکتا ہے۔ تلوار بزورِ بازو تو محسوس اکراہ ہے۔ اس میں تو آپ دیکھیں گے کہ لوگ نکلے، انہوں نے سر دیدیا لیکن غلط بات نہیں مانی۔ اس قلب ونگاہ کو ماؤف کرنے میں آپ دیکھیں گے کہ قدم قدم پر نظر آرہا ہے کہ غلط بات ہورہی ہے مگر عقیدت ہے کہ آنکھیں بند کیے چلے جارہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! آپ نہیں جانتے، یہ بڑے دور کی باتیں ہیں، یہ باتیں عالم بالا کی ہیں، وہ اس کے متعلق خوب جانتے ہیں۔ یعنی کامیابی ہو تب بھی وہ مطمئن ہیں، ناکامی ہو تب بھی وہ مطمئن ہیں۔ ایک پروگرام کی ناکامیوں کے بعد نظر آتا ہے کہ یہ جو متبعین کی جماعت ہے، وہاں کھڑے ہوکر یہ سوچے گی کہ نہیں صاحب! وہ پروگرام غلط تھا، اس میں ناکامیاں ہوئیں، وہاں پہنچ کر بھی ان کو وہ اس قسم کا جھنجھنا دیا جاتا ہے کہ وہ ناکامیوں کو کامیابیاں سمجھنے لگ جاتے ہیں ''ایویں ای لوگ رولا پوندے رہندے ہیگے نیں جی، اینوں جتیاں پیاں جتیاں پیاں۔ لوکاں نوں گل کرن لگیاں شرم وی نئیں کتھے اوندے، اوجتیاں سن، اینے اینے تے بچکانے سن [1]'' لیکن قربان جایئے ماننے والوں کے، وہ بھی مانتے ہیں کہ سبحان اللہ صاحب! واقعی ''اوہنوں جتیاں نئیں سن پیاں پروپیگنڈہ ہورہا اے جناب سب کچھ'' (اسے جوتے نہیں پڑے تھے۔ یہ تو جناب! سب کچھ محض پروپیگنڈہ تھا)۔ یہ چیز ہے کہ جس سے قلب ودماغ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کرلیا جائے۔ عزیزانِ من! یہ ہے اکراہ، جہاں قوم کو تباہ کیا جاتا ہے۔

کہا ہے کہ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (4:153) ہم نے کتاب دی، کہا کہ غور وفکر کرو، دیکھو تو سہی کہ کس طرح سے ان چیزوں پہ پورا اترتی ہے۔ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ایسے نہیں، ہم ایمان لائیں گے کہ یہ جو کتاب ہے یہ آسمان سے لکھی لکھائی اترے ''جلد بنی بنائی اتوں تری اون ڈئی ہووے'' (جلد بنی ہوئی اوپر سے نازل ہوئی آرہی ہو) یعنی ایسے کتاب اتارو تو پھر ہم ایمان لائیں گے۔ دیکھا ذہنیتیں! کرامات کے زور پر تو خدا کو مانیں گے کہ آسمان سے یوں کتاب اتارو۔

---

[1] لوگ یونہی شور مچاتے رہتے ہیں کہ اسے جوتے پڑے جی! لوگوں کو بات کرتے ہوئے کہیں شرم بھی نہیں آتی۔ وہ جوتے تھے، سنو! وہ تو بچگانے تھے!

(32) حضرت موسیٰؑ سے یہودیوں کا مطالبہ کہ آسمانوں سے خدا کو ہمارے سامنے لاؤ

بعض اوقات تو قرآنِ مجید ایسا جواب دیتا ہے کہ صاحب! پوچھو نہیں' طبیعت میں بشاشت آ جاتی ہے۔ یعنی اس کے متعلق بیسیوں چیزیں اور جگہ آئی ہیں' جواب دیا ہے' یہاں دیکھو۔ یہودیوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ آسمان سے کتاب اتارو فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ (4:153) تم سے تو انہوں نے اتنی سی بات کہی کہ آسمان سے کتاب اتارو مگر اپنے رسول سے تو اس سے بھی زیادہ مطالبے پیش کیا کرتے تھے یعنی کہا کرتے تھے کہ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (4:153) خدا کو سامنے بٹھا کر ہمیں دکھاؤ۔ میں نے کہا ہے کہ بعض اوقات تو قرآنِ کریم ایسی عجیب بات کرتا ہے یعنی ان کی ذہنیت بتانا تھا کہ کیا ہے۔ تم سے تو یہ اتنا ہی کہہ رہے ہیں' اپنے پیغمبر سے تو یہ اس سے بھی بڑی بات کہتے تھے' اس سے کتاب ہی نہیں مانگتے تھے' کہتے یہ تھے کہ خدا اوپر سے ہمارے سامنے آ کر یوں کھڑا ہو جائے' پھر تو ہم خدا کو مانیں گے ورنہ نہیں مانیں گے۔ پھر ہوا کیا؟ کہا کہ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ (4:153) ۔ظلم کے معنی ہیں کہ ''جو شے جہاں ہونی چاہیئے' وہاں نہ رکھیں''۔ کتاب کے متعلق یہ نہ سمجھنا کہ یہ عقل وفکر کو اپیل کرنے والی چیز ہے' نبی کے متعلق یہ نہیں کہنا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات لا کر اس کو چلائے گا' بس یہ سمجھنا کہ کرامات دکھاتا پھرے گا' شعبدے بازیاں دکھاتا پھرے گا۔ اسے قرآنِ کریم نے ظلم کہا ہے۔ چنانچہ اس قسم کی توہم پرستیاں یا اس قسم کے مطالبات جو تھے اس کی وجہ سے اس قوم پر ایک گرفت آئی۔ پھر ہوا کیا؟ آخر اس قوم کی ذہنیت کا نتیجہ کیا ہوا؟

(33) واضح دلائل اور روشن تعلیم کو ٹھکرا کر کرامات دیکھنے والی قوم کا حشر

عزیزانِ من! سوچیئے! یہ بات ان یہودیوں کی نہیں ہو رہی' جنہوں نے یہ مطالبے کیے کہ اس قسم کے معجزے دکھایئے۔ وہ معجزات والی بات ختم ہو گئی تو کرامات تک اتر آئے۔ انہوں نے کیا یہ کہ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ (4:153) ایسے واضح دلائل آنے کے بعد ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ سامری نے ایک بچھڑا سا بنایا' اس کے گلے میں ذرا سی خلا رکھی کہ اس میں ہوا جاتی تھی تو وہ سیٹی بجایا کرتا تھا یا آواز نکالا کرتی تھی اور وہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ میں نے کہا ہے کہ جب عقل وفکر ماؤف ہو جائے تو وہ خدا کو اپنے سامنے دیکھنا تو ایک طرف رہا' جب وہ نظر نہیں آتا تو اگر کوئی اتنی سی چیز بھی ان کے سامنے کر دے' وہ اسی پر ایمان لے آتے ہیں' اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ حضرت صاحب جو ہیں' وہ تو بڑی کرامت کے مالک ہیں' ہم نے دیکھا صاحب! کہ انہوں نے ہمارے سامنے یہ بالوں کو پکڑا اور یوں نچوڑا اور اس میں سے دودھ کے قطرے نکل آئے۔ ''او بکری دے دودھ دا پکھانا ہونداا ے ہتھ اچ رکھیا ہویا'' (بکری کے دودھ کا غبارہ ہاتھ میں رکھا ہوا ہوتا ہے)۔ بس ہوئے ہیں گرویدہ۔ ''سٹے دے نمبر' جناب! بڑے صحیح دسدا پیا ہیگا'' (سٹے کے نمبر بڑے صحیح بتا رہا ہے)۔

(34) قرآن کریم کی تعلیم انسانوں کی ذہنیت کو تبدیل کر دیتی ہے

قرآنِ حمید ذہنیت کی بات کرتا ہے کہ اتنے اتنے بڑے مطالبوں سے نیچے اترتے ہیں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ذرا سا خلاف

معمول کوئی واقعہ سامنے آیا اور سجدے میں گرے۔ عزیزانِ من! کیا یہی حالت اس قوم کی نہیں ہوگئی ہوئی جنہیں قدم قدم پہ یہ کہا گیا تھا کہ یہاں ذہنی اکراہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟ کیا یہ قوم وہاں آتی ہے جہاں عقل وبصیرت کی بنیادوں پہ ذہن میں سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے یا وہاں جاتی ہے جہاں عقل وبصیرت کے تمام سرچشموں کو مفلوج کیا جاتا ہے؟ ہر خانقاہ پہ جانا' ہر قبر پہ جانا' ہر فقیر کے ہاں جانا' ہر صاحبِ کرامات کی باتیں ماننا' ہر حضرت صاحب کے پاؤں جا کر چومنا' یہ کیا چیز ہے؟ یہ گوسالہ پرستی ہے۔ کہا ہے کہ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ (4:153) اگر وہ بات نہیں دکھائی گئی تو کوئی بات نہیں صاحب! ہم اسے پوچھ لیں گے۔ کہا ہے کہ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ (4:153) او! اس قدر واضح دلائل وبصیرت کی چیزیں تمہارے سامنے آئیں اور اس کے بعد بھی تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اپنے سامنے تمہارے سامری نے یہ گوسالہ بنایا تھا اور صرف اتنی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ صاحب! آواز کیسے نکل رہی ہے اور تم اس کے سامنے جھک گئے۔ پھر یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ وہ صاحبِ شرف انسان کہ جس کے لیے کہا ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (45:13) ساری کائنات تابع تسخیر ہے' وہ انسان پتھر اور چونے کی عمارت پر جا کر سر جھکا رہا ہے جس کے لیے کہا تھا کہ سارے ملائکہ نے اس کے سامنے سر جھکایا۔ یہ مسجود ملائک' پتھروں کے سامنے جا کر ان کا ساجد بنتا ہے۔ اس سے زیادہ ذلت کیا ہوگی۔

(35) ہماری پوری تاریخ قومِ بنی اسرائیل سے مماثل دکھائی دیتی ہے

کہا ہے کہ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ (4:153)۔ اس کے باوجود ہم نے دیکھا کہ قوم میں کچھ صلاحیت ہے تو فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ (4:153) ہم نے ان کی اس حماقت سے بھی درگزر کیا۔ پتہ نہیں ہمارے ساتھ یہ معاملہ بھی ہوگا یا نہیں ہوگا۔ یہاں کہا ہے کہ پھر ہم نے ان کو ایک موقع دیدیا۔ شاید ہندوستان کے مسلمان کو یہ آخری موقع تھا جو پاکستان کی شکل میں ملا۔ عزیزانِ من! بنی اسرائیل کی داستان قدم بقدم ہماری داستان سے ملتی ہے۔ فرعون کی غلامی سے نجات کے بعد سینا کے صحراؤں کے اندر تو اس نے ہمیں لا کر بٹھا دیا اور اب کیفیت یہ ہے کہ ہم نے پھر اپنی پرستش کے لیے گوسالے تراش لیے ہیں' ان کی شکلیں کچھ ہوں' وضع قطع کوئی ہو' شاید اس کے بعد یہ کیفیت ہو کہ جو قرآنِ حکیم نے کہا تھا کہ موسیٰؑ! اس قوم کو چالیس سال تک ان صحراؤں کے اندر سرگرداں پھراؤ تاکہ ان کا نام ونشان مٹ جائے اور یہ جو آنے والی نسل ہے اس کی تعلیم وتربیت کرو۔ اس کی تعلیم صحیح کی تو اس نے ایک جھپٹا مارا' وہ سرزمین جس کے متعلق کہا تھا کہ ہم نے ان کے نام لکھ دی ہے وہ اس قوم کے نصیب میں نہ ہوئی۔ اُنہوں (نئی نسل نے) نے آ کر یہ کچھ لیا۔ یہ تھا جو کہا ہے کہ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ (4:153)۔ اور ہم تو آنے والی نسلوں کی بھی تربیت نہ کر سکے۔ کہا ہے کہ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (4:153) ہم نے موسیٰؑ کو بڑے کھلے ہوئے دلائل دیئے تھے۔

آگے کہا ہے کہ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (4:154) وہ تو ایک عہد و پیمان کر کے آئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد

یا اس سے پہلے ہمارے عہد و پیمان کو دیکھیے ہم اس سرزمین کو اس لیے حاصل کر رہے ہیں کہ یا اللہ! یہاں تیری بادشاہت کا تختِ جلال بچھے' تیرے قوانین کی حکومت ہو' ہم اس کے تابع چلیں۔ قرآنِ حکیم یہ کہتا ہے کہ ایک طرف طور جیسی ایک آہنی دیوار ان کے پیچھے حفاظت کے لیے ہے کہ ادھر سے کوئی حملہ آور نہ آ جائے' حفاظت کا سامان دیا' وہاں ان سے عہد و پیمان لیا۔ کہا یہ ہے کہ یہ نئی سرزمین' نئی مملکت' تمہیں دی جا رہی ہے' اس میں تم قدم رکھو۔ اس لیے کہ اُدۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا (4:154) قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے آؤ۔ اس کا یہ مقصد تھا۔ کہا ہے کہ ہم نے انہیں اخلاقیات یا ضوابط یا پابندیوں کے متعلق کہا۔ عزیزانِ من! آزادی نام ہے ان پابندیوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ کہا ہے کہ ان سے تجاوز نہ کرنا' ان سے سرکشی اختیار نہ کرنا۔ شروع میں چھوٹی چھوٹی سی باتیں کہیں مثلاً یہ کہ ہفتے میں ایک دن ناغہ کر لیا کرو' سوچو تو سہی کہ یہ کونسی ایسی قیامت ہے یا پابندی ہے۔

(36) اخلاقی لحاظ سے چھوٹی چھوٹی پابندیوں کے سلسلہ میں ہماری بدعملی کا تذکرہ

آپ کو پتہ ہے کہ گوشت کے ناغے والے دن بازار کی طرف جو دروازہ ہوتا ہے اُسے تو بند کر دیا جاتا ہے مگر پچھلی طرف کی جو کھڑکی ہے اسے کھلا رکھا جاتا ہے۔ کہا تھا کہ ایک دن ناغہ کر لیا کرو۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ اس میں بھی چور بازاری کیا کرتے تھے۔ وَاَخۡذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا (4:154) یہ وہی قوم تھی جو ابھی کل یہ قسمیں کھا کر آئی تھی کہ ہم تیرے قانون کے سامنے جھکیں گے' کیفیت ان کی یہ ہوگئی۔ کہا کہ فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَ كُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّقَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ (4:155) ان کے یہ جرائم تھے وہ عہد و پیمان انہوں نے توڑا' خدا کے قوانین سے انہوں نے سرکشی برتی' انبیا جو حق بات کہنے والے تھے ان کو ناحق انہوں نے قتل کیا۔ جب بھی کسی نے ان سے کہا کہ بھائی! یہ سوچ سمجھ کی بات ہے' اسے سنو تو کہا کہ او جاؤ جاؤ بابا! ہمیں سب معلوم ہے' ہمارے پیالے بھرے ہوئے ہیں' اس میں پانی کا ایک قطرہ اور نہیں پڑ سکتا' ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں اور ہم کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

(37) دلوں پر تالے پڑنے کی وجہ جواز اور پھر انہیں کھولنے کا طریق

کہا ہے کہ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ (4:155) ان کا یہ انکار تھا جس کی وجہ سے ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے۔ اور فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا (4:155) شاید ان میں سے کچھ ایسے نکل آئیں گے جو ایمان لائیں ورنہ ان سے تو کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

عزیزانِ من! سورۃ النساء کی آیت 155 تک ہم آ گئے' آئندہ 156 ویں آیت سے لیں گے۔ اس کے بعد مضمون بھی دوسرا شروع ہوتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر ہے۔ اسے ہم آئندہ لیں گے۔

علامہ پرویز علیہ الرحمۃ کی اہم کتاب

ختمِ نبوّت ﷺ اور تحریکِ احمدیّت

کا تعارف اور پس منظر

آغازِ سُخن:

جولائی 1973ء کی بات ہے (ہفتہ وار) چٹان (لاہور) کے نمائندہ نے میرا ایک انٹرویو لیا جو اُس اخبار میں بھی چھپا اور بعدازاں، طلوعِ اسلام بابت اگست 1973ء میں بھی شائع ہوا۔ اس انٹرویو کے ایک سوال کے جواب میں، میں نے اپنے کوائفِ زندگی بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> میری پیدائش مشرقی پنجاب کے قصبہ بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں ہوئی۔ بٹالہ ایک مذہبی شہر تھا اس لئے (اس دور کی عام فضا کے مطابق) وہاں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علاوہ، آریوں، عیسائیوں اور قادیانیوں سے اکثر مناظرے رہا کرتے تھے۔ اس طرح مجھے فرقوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کا موقعہ مل گیا۔ بعد میں مختلف فرقوں کے باہمی مباحثوں یا آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ مناظروں کا دور تو ختم ہو گیا۔ لیکن ختمِ نبوت ﷺ کے موضوع پر میں مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں، کیونکہ میرے نزدیک انکارِ ختمِ نبوّت ﷺ کا فتنہ اُمت کے لئے بڑا خطرناک ہے۔ چونکہ میں اس مسئلہ پر قرآنِ خالص کی روشنی میں گفتگو کرتا ہوں، روایات میں نہیں الجھتا۔ اس لئے فریق مقابل کے پاس میرے دلائل کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔

چونکہ مسئلہ ختمِ نبوت نے ان دنوں ملک میں پھر خاص اہمیت اختیار کر لی تھی، بالخصوص اس مطالبہ کے پیشِ نظر کہ 'مرزائیوں'' کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، اس لئے (اقتباسِ بالا کے خط کشیدہ الفاظ سے متاثر شدہ احباب کی طرف سے) ملک کے مختلف گوشوں سے تقاضے موصول ہونے لگے کہ میں اس اہم مسئلہ پر، جامع طور پر لکھوں تا کہ ذہنوں میں اُبھرنے والے مختلف سوالات ایک ہی دفعہ اطمینان بخش انداز سے حل ہو جائیں۔ ان تقاضوں کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق میری تصنیف ''معراجِ انسانیت'' [1] کے پہلے ایڈیشن کے آخری باب میں، میں نے مسئلہ

---

[1] معراجِ انسانیت کا پہلا ایڈیشن 1949ء میں شائع ہوا تھا۔ طلوعِ اسلام ٹرسٹ

ختمِ نبوت پر مختصراً لکھا تھا لیکن جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا' تو اس باب میں سے وہ حصہ نکال دیا گیا جس کا تعلق ''قادیانیت'' سے تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ''یہ موضوع ایک مستقل تصنیف کا متقاضی ہے۔'' تقاضا کرنے والے احباب نے میری توجہ اس طرف بھی منعطف کرائی۔ اس سلسلہ میں ایک خاص بات یہ بھی سامنے آئی کہ بعض ''احمدی'' حضرات کی طرف سے بھی یہ مطالبہ ہوا کہ مجھے اس موضوع پر تفصیل سے لکھنا چاہئے۔ تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ قرآنِ کریم کی روشنی میں اس مسئلہ کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے۔ ان میں سے بعض خطوط میں مجھے جذبۂ تلاشِ حق کی جھلک محسوس ہوئی۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ عام طور پر ''احمدی'' حضرات کا قرآنِ کریم کا مبلغ علم ان چند آیات اور ان کے مخصوص مفہوم تک محدود ہوتا ہے جنہیں بحث ومباحثہ کے لئے انہیں یاد کرادیا جاتا ہے۔ اس لئے جب یہ کہا جائے کہ ''قرآنِ خالص کی روشنی میں گفتگو کی جائے تو فریقِ مقابل کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔'' تو ان کا جذبہ تجسس قابلِ فہم ہوسکتا ہے۔

ان مطالبات کے علاوہ قرآنِ کریم کی روشنی میں اس مسئلہ پر گفتگو کی اہمیت کی ایک اور وجہ بھی میرے پیش نظر تھی۔

مقدمۂ بہاولپور:

1926ء کا ذکر ہے' ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے خاوند نے قادیانی مسلک اختیار کرلیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتد ہوگیا ہے۔ اس لئے اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کرلی اور مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ اس لئے نہیں کہ اس میں فریقین کی حیثیت بڑی ممتاز تھی۔ وہ تو بالکل غیر معروف سے تھے۔ یہ اس لئے کہ ہندوستان میں (غالباً) یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک شخص قادیانی مسلک اختیار کرنے کے بعد مسلمان رہتا ہے یا نہیں۔ اس اعتبار سے یہ مقدمہ متعلقہ فریقین کا مابہ النزاع معاملہ نہ رہا بلکہ قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے مابین ایک دینی سوال بن گیا جس کا عدالتی فیصلہ (ظاہر ہے کہ) بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخر الامر محمد اکبر صاحب ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے (جواب مرحوم ہوچکے ہیں)۔ 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سنادیا۔ یہ فیصلہ اپنی شہرت اور اہمیت کے پیش نظر' اس زمانے میں بھی الگ چھپ گیا تھا اور اس کے بعد بھی چھپتا رہا۔ اس وقت میرے سامنے اس کا وہ نسخہ ہے جو حال ہی (جون 1973ء) میں ''محفل ارشادیہ' سیالکوٹ'' کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ اس فیصلہ کے صفحہ 53 پر بتایا گیا ہے کہ مدعیہ کی طرف سے بڑے بڑے جید علماء کرام بطورِ گواہ پیش ہوئے۔ مثلاً مولانا غلام محمد صاحب' شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور' مولانا نجم الدین صاحب' پروفیسر اورینٹل کالج لاہور' مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند' مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری اور مولانا سید انور شاہ صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند وغیرہم۔ اس سے اس مسئلہ کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ اس مسئلہ کا سارا دارومدار اس بات پر تھا کہ نبوّت کی حقیقت کیا ہے' اور نبی کسے کہتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ:

موجودہ زمانے میں بہت سے مسلمان نبی کی حقیقت سے بھی نا آشنا ہیں۔ اس لئے بھی ان کے دلوں میں یہ مسئلہ گھر نہیں کرسکتا کہ مرزا صاحب کو نبی ماننے میں کیا قباحت ہوتی ہے کہ جس پر اس قدر چیخ پکار کی جارہی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی کچھ تھوڑی سی حقیقت بیان کردی جائے۔ مدعیہؑ کی طرف سے نبی کی کوئی تعریف بیان نہیں کی گئی۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ نبوت ایک عہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے برگزیدہ بندوں کو عطا کیا جاتا رہا ہے اور نبی اور رسول میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے اور نبی کے لئے لازمی نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ فریقِ ثانی نے (بحوالہ تہراس، ص:89) بیان کیا ہے کہ رسول ایک انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ احکامِ شریعت کی تبلیغ کے لئے بھیجتا ہے، بخلاف نبی کے وہ عام ہے۔ کتاب لائے یا نہ لائے۔ رسول کے لئے کتاب لانا شرط ہے۔ اسی طرح رسول کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جو صاحبِ کتاب ہو یا سابقہ شریعت کے بعض احکام کو منسوخ کردے۔ (فیصلہ، ص:107۔106)

اس کے بعد فاضل جج نے لکھا:

یہ تعریفیں چونکہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی نہ تھیں اس لئے میں اس جستجو میں رہا کہ نبی یا رسول کی کوئی ایسی تعریف مل جائے جو تصریحاتِ قرآن کی رُو سے تمام لوازم نبوّت پر حاوی ہو۔ (ص:107)

اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ انہوں نے اس باب میں کافی جستجو کی لیکن نبیؑ کی کوئی جامع تعریف انہیں نہ مل سکی۔ آخر کار ایک رسالہ میں ایک مضمون بہ عنوان ''میکانکی اسلام'' از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویزؔ میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق آج کل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں نبوت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے، میری رائے میں، اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جاسکتی اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس سے انکار بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں ان کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں۔ (ص:107)

ازاں بعد انہوں نے میرے اُس مضمون سے خاصا مفصل اقتباس درج کیا اور نبیؑ کی جو تعریف میں نے پیش کی تھی اس پر مبنی بحث کے بعد اپنے فیصلہ میں کہا کہ:

مدعا علیہ، قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے، لہٰذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخِ ارتداد مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے۔ (ص:182)

مذکورہ بالا فیصلہ میں فاضل جج نے لکھا ہے کہ ان کی عدالت میں (غیر منقسم) ہندوستان کے بڑے بڑے جید علماء حضرات پیش ہوئے جن میں سے ایک ایک کا بیان سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھا لیکن وہ حقیقتِ نبوت کے متعلق ان میں سے کسی کے بیان سے بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ وہ مطمئن ہوئے تو میرے ایک ایسے مضمون سے جو اس مقدمہ سے بالکل الگ آزادانہ لکھا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ میرے مضمون کی وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ اس قدر اطمینان بخش ثابت ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک متداول علومِ شرعیہ (فقہ، حدیث وغیرہ) کا تعلق ہے، ان علماء کرام کا مقام بہت بلند تھا جو اس عدالت میں پیش ہوئے تھے۔ لیکن میرے مضمون کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی بنیاد خالص قرآنی حقائق پر تھی۔ میں اس میں، فقہ اور روایات پر مبنی بحثوں میں الجھا ہی نہیں تھا۔ ختمِ نبوت کا مسئلہ جو قادیانی اور غیر قادیانی حضرات میں، ساٹھ، ستر برس سے مسلسل بحث و نظر کا موضوع بنے چلا آ رہا ہے اور بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پر مصروفِ گردش ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس بحث کا مدار روایات پر ہوتا ہے اور روایات کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے مجموعوں میں مخالف اور موافق ہر ایک کو اپنے اپنے مطلب کے مطابق روایات مل جاتی ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ بحث اصل موضوع سے ہٹ کر فریقین کی طرف سے پیش کردہ حدیثوں کے صحیح یا ضعیف ہونے پر مرکوز ہو جاتی ہے اور یوں محملِ لیلےٰ، غبارِ ناقۂ لیلےٰ میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن جو کچھ پیش کرتا ہے، حتمی، یقینی اور دوٹوک پیش کرتا ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی مسئلہ کے متعلق اس میں فریقین کو اپنے اپنے مطلب کے مطابق اختلافی آیات مل جائیں۔ یہ وجہ ہے کہ میں روایات میں نہیں اُلجھتا۔ میں جو کچھ پیش کرتا ہوں اس کی اساس قرآنی دلائل پر ہوتی ہے اور فریقِ مقابل سے بھی قرآنی سند کا مطالبہ کرتا ہوں۔ نتیجہ یہ کہ بات بالکل نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

احادیث کی پوزیشن:

حدیث کی تاریخ اور صحیح پوزیشن کے متعلق، میں مختلف مقامات پر بڑی شرح و بسط سے لکھتا چلا آ رہا ہوں (میری، حال میں شائع شدہ تازہ تصنیف ''شاہکارِ رسالت'' کے آخری باب میں، اس تفصیل کا ملخص بڑے جامع و مانع انداز سے دیا گیا ہے) یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے یا مرتب کرا کر، اپنی تصدیق کے ساتھ اُمت کو نہیں دیا۔ حضور ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد، بعض حضرات نے انفرادی طور پر، ان اقوال کو جمع اور مرتب کیا جنہیں حضور ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اس طرح احادیث کے مختلف مجموعے وجود میں آئے۔ ان مجموعوں میں جو روایات درج ہیں ان میں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ یہ جو ہمارے ہاں مختلف فرقوں میں باہمی اختلافات پائے جاتے ہیں تو ان کی وجہ یہ ہے کہ ایک فرقہ ایک حدیث کو صحیح قرار دے کر اس کے مطابق عمل کرتا ہے اور دوسرا فرقہ اسے غلط (ضعیف و وضعی) قرار دے کر، اس کے خلاف کسی دوسری روایت پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ لہٰذا، جب بات کسی حدیث تک پہنچے گی تو سب سے پہلے یہ سوال سامنے آئے گا کہ آیا وہ حدیث قولِ رسول ﷺ ہے بھی یا نہیں۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، اپنے فریقِ مخالف کے ساتھ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور غلط ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی مودودی صاحب کے فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول ﷺ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔

(رسائل ومسائل، حصہ اوّل، ص:290)

لہٰذا، جب فیصلہ کا مدار حدیث پر رکھا جائے گا تو سب سے پہلے یہ سوال سامنے آئے گا کہ وہ حدیث صحیح بھی ہے یا نہیں۔ ایک فریق اسے صحیح قرار دے گا اور دوسرا فریق غلط اور اس کے خلاف اپنی طرف سے پیش کردہ حدیث کو صحیح۔ اس باب میں دیکھئے کہ مرزا غلام احمد صاحب کا مؤقف کیا تھا۔ قادیانی حضرات کے خلیفۂ ثانی (مرزا محمود احمد صاحب) کا ارشاد ہے:

حضرت مسیح موعود (یعنی مرزا صاحب) فرمایا کرتے تھے کہ حدیثوں کی کتابوں کی مثال تو مداری کے پٹارے کی ہے۔ جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔ (خطبہ جمعہ، مندرجہ اخبار الفضل، مورخہ 15 جولائی 1924ء)

خود مرزا صاحب نے لکھا ہے:

اور جو شخص حکم ہو کر آیا ہے، اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے، خدا سے علم پا کر قبول کر لے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پا کر ردّ کر دے۔ (تحفہ گولڑویہ، ص:10)

اس ''ردوقبول'' کا معیار کیا ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں:

میرے اس دعویٰ کی بنیاد حدیث نہیں بلکہ قرآن اور وحی ہے جو میرے پر نازل ہوئی۔ ہاں تائیدی طور پر ہم وہ حدیثیں بھی پیش کرتے ہیں جو قرآن شریف کے مطابق ہیں اور میری وحی کے معارض نہیں اور دوسری حدیثوں کو ہم ردّی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔ (اعجاز احمدی، ص:30)

لہٰذا احادیث کی صحت وسقم کے متعلق مرزا صاحب کا معیار یہ ہے کہ جو حدیث ان کی وحی کے مطابق ہے وہ صحیح ہے، جو اس کے خلاف ہے وہ ردّی کی طرح پھینک دینے کے قابل۔ دوسری طرف مودودی صاحب کا معیار بھی ایسا ہی ہے۔ مرزا صاحب اپنی وحی کو معیار قرار دیتے ہیں۔ مودودی صاحب [1] ''مزاج شناسِ رسول ﷺ کی نگہ بصیرت'' کو معیار ٹھہراتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ حدیث کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے:

جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے حدیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج شناس ہو جاتا

---

[1] ہم نے مودودی صاحب کا حوالہ بالخصوص اس لئے دیا ہے کہ ان مباحث پر، ہمارے زمانے میں سب سے زیادہ (کثرت کے ساتھ) وہی لکھتے ہیں۔

ہے۔۔۔اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔۔۔اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب' ضعیف' منقطع السند' مطعون فیہ' حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل' غیر شاذ' متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوتی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی ﷺ کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات' حصہ اوّل' ص:302' ص:324)

حتیٰ کہ وہ یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ:

جن مسائل میں اس کو (مزاج شناسِ رسول کو) قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی' ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ (ایضاً' ص:324)

آپ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں (مرزا صاحب اور مودودی صاحب) کا معیار انفرادی اور موضوعی (Subjective) ہے جس کے پرکھنے کا کوئی خارجی معیار نہیں ہوسکتا۔ چونکہ مودودی صاحب کا معیار وہی ہے جسے مرزا صاحب نے پیش کیا تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ مودودی صاحب اسے ''مزاج شناس رسول ﷺ کی نگہ بصیرت'' قرار دیتے ہیں۔ اور مرزا صاحب اسے ''خدا سے پایا ہوا علم'' کہتے ہیں۔ اس لئے مرزا صاحب کی طرح ان کی بھی سخت مخالفت ہوتی ہے۔ اس باب میں جماعت اہلِ حدیث کے سابق صدر مولانا اسمٰعیل (مرحوم) اپنے کتابچہ ''جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث'' میں لکھتے ہیں:

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول ﷺ کا مزاج شناس تصور کرلے۔ پھر اسے اختیار دے دے کر اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرلے اور جسے چاہے رد کردے۔۔۔تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسول ﷺ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (ص:63)

ان حالات میں آپ سوچئے کہ اگر کسی مسئلہ کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار حدیث کو قرار دیا جائے تو اس مسئلہ تک پہنچنے سے پہلے' فریقین کی پیش کردہ احادیث کے صحیح یا غلط ہونے کی بحث چھڑ جائے گی اور یہ بحث ایسی ہے کہ اس کا فیصلہ ہزار برس سے ہو نہیں پایا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ختمِ نبوت جیسا اہم سوال جو دین کی بنیاد اور اسلام کا مرکزی ستون ہے' ساٹھ ستر برس سے بحث وجدل کی آماجگاہ بنے چلا آرہا ہے اور ہمارے عوام (جن میں وہ تعلیمیافتہ حضرات بھی شامل ہیں' جنہیں دین کا براہِ راست علم نہیں) حیران و پریشان ہیں کہ کسے سچا سمجھیں اور کسے جھوٹا۔

احادیث کے پرکھنے کا معیار:

میرے نزدیک دین میں سند اور حجت خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) ہے' اور احادیث کے پرکھنے کا معیار یہ کہ جو حدیث

قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف نہیں جاتی' اسے حضور ﷺ کا ارشاد تسلیم کیا جاسکتا ہے اور جو حدیث اس کے خلاف جاتی ہو اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں ہوسکتی۔ مجھے منکرِ حدیث قرار دیا جاتا ہے تو وہ اس لئے نہیں کہ میں صحیح احادیث کا منکر ہوں۔ میری کتاب ''معراجِ انسانیت'' میں دیکھئے' میں نے کتنی حدیثیں درج کی ہیں۔ میں درحقیقت منکر ہوں ان حضرات کے وضع کردہ ''معیارِ حدیث'' کا چونکہ قرآنِ کریم کو صحیح اور غلط کا معیار قرار دینے سے ان حضرات کے اکثر معتقدات' نظریات اور مسالک' خلافِ قرآن (فلہٰذا غلط) قرار پاتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے عوام کا رُخ دوسری طرف موڑنے کے لئے یہ حربہ اختیار کر رکھا ہے کہ مجھے منکرِ حدیث اور منکرِ شانِ رسالت ﷺ مشہور کر دیا جائے۔ آئندہ صفحات میں آپ دیکھیں گے کہ ''احمدی'' حضرات تو ایک طرف' خود سنیوں کے کس قدر معتقدات ایسے ہیں جن کی تائید میں وہ احادیث پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ قرآن کے خلاف ہیں اور یہی وہ مقامات ہیں جہاں یہ حضرات ''احمدیوں'' سے بحث کرتے ہوئے مات کھا جاتے ہیں۔ ''احمدی'' حضرات اس صورت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں ان کا فائدہ ہے۔ اس لئے وہ بھی مجھے منکرِ حدیث قرار دے کر میری مخالفت کرتے ہیں۔ یہ اس لئے نہیں کہ انہیں ارشاداتِ نبوی ﷺ سے اس قدر عقیدت ہوتی ہے بلکہ اس لئے کہ قرآنِ خالص کو معیار و مدار تسلیم کرنے سے ان کے دعاوی باطل قرار پاجاتے ہیں۔ یہ ہے حدیث کے ساتھ ان حضرات کی وابستگی کا راز یعنی

حکایتِ قدِ آں یارِ دل نواز کنم بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

میرا تعلق کسی فرقہ سے نہیں:

اس تمہیدی وضاحت کے بعد میں آگے بڑھتا ہوں۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر' میں اتنی وضاحت اور ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق کسی فرقہ سے نہیں' میں سیدھا سادہ مسلمان ہوں اور قرآنِ کریم کا ادنیٰ سا طالبِ علم اور اس کی تعلیم کا مبلغ' ختمِ نبوت چونکہ (میری بصیرتِ قرآنی کی رُو سے) دین کی اصل اور اسلام کی بنیاد ہے' اس لئے میں اسے اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کو قرآنِ کریم کی روشنی میں واضح طور پر سامنے لاؤں۔ میں نہ کسی سے بحث کرنا چاہتا ہوں نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا۔ میں اس موضوع کو علمی سطح پر رکھنا چاہتا ہوں۔ مرزا صاحب کی تحریروں میں بہت کچھ ایسا بھی ہے جسے ''عام بازاری سطح'' پر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن میں اس سے احتراز کروں گا' مرزا صاحب کا دعویٰ نبوت کا ہو یا مثیلِ مسیح وغیرہ کا۔ میری تحقیق کی رُو سے یہ تمام دعاوی قرآنِ کریم کے خلاف اور کذب و افتراء ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ایک جماعت کے نزدیک واجب الاحترام ہیں' اور قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ تم مشرکین کے معبودوں کے متعلق بھی کوئی دلآزارانہ بات نہ کرو (6:109) اس لئے میں انہیں ''مرزا صاحب'' کہہ کر پکاروں گا۔ مرزائی حضرات اپنے آپ کو ''احمدی'' کہتے ہیں لیکن میں ان کی اس نسبت کو صحیح نہیں سمجھتا۔ کیونکہ احمد ﷺ' حضور نبی اکرم ﷺ کا اسمِ گرامی تھا اور یہ حضرت رسول اللہ ﷺ کی جہت سے اپنے آپ کو احمدی نہیں کہتے بلکہ مرزا غلام احمد صاحب کی نسبت سے

ایسا کہتے ہیں۔ بایں ہمہ میں انہیں ''احمدی'' کہہ کر ہی پکاروں گا کیونکہ یہ 'مرزائی' کہلانے سے گریز کرتے ہیں۔

میں الفاظ کے استعمال میں اس قدر احتیاط اس لئے ضروری خیال کرتا ہوں کہ ان حضرات میں شاید کوئی سعید روحیں ہوں جو نیک نیتی سے حق کی متلاشی ہوں تو وہ میری معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکیں۔ الفاظ میں بے احتیاطی' فریقِ مخالف میں نفرت اور تعصب پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے تاکید کی ہے کہ: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (16:125) ''تم ان لوگوں کو حکمت و موعظت سے' خدا کے راستے کی طرف دعوت دو' اور ان سے اختلافی امور میں بطریقِ احسن بات کرو۔''

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ''مسئلہ قادیانیت'' سے میری دلچسپی شروع سے چلی آتی ہے۔ اُس زمانے میں' میں نے مرزا صاحب کی قریب قریب تمام تصانیف کا مطالعہ کیا تھا اور (اپنے معمول کے مطابق) ان سے اہم مقامات کے نوٹ لیا کرتا تھا۔ یہی نوٹ بعد میں میری تحریروں میں اقتباسات کی صورت میں آ جاتے تھے۔ زیرِ نظر کتاب کی تالیف کے وقت مجھے مرزا صاحب کی اکثر کتابیں میسر نہیں آ سکیں۔ اس لئے میں نے اقتباسات کے لئے زیادہ تر اپنے نوٹس پر انحصار کیا ہے لیکن ان کے حوالوں کو پروفیسر الیاس برنی (مرحوم) کی کتاب ''قادیانی مذہب'' سے چیک کر لیا ہے۔ کتابوں کے مختلف ایڈیشنوں کی وجہ سے بعض اوقات صفحات کے نمبروں میں فرق پڑ جاتا ہے اس لئے میرے حوالوں میں اس قسم کا فرق ہو سکتا ہے۔ ویسے ان کی صحت کا حتیٰ الامکان بڑا اخیال رکھا گیا ہے۔ بایں ہمہ' یہ ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا امکان ہر وقت ہو سکتا ہے اگر کسی حوالہ میں شک گزرے تو آپ مجھ سے دریافت فرما سکتے ہیں۔ لیکن میں کسی کے ساتھ بحث میں نہیں اُلجھوں گا۔

جہاں تک آیاتِ قرآنی کے حوالوں کا تعلق ہے تو اوپر سورۃ کا نمبر دیا گیا ہے اور نیچے آیت کا مثلاً (2:36) سے مراد ہے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر: 36۔ قرآنِ کریم کے بعض نسخوں میں آیات کے شمار میں ایک آدھ کا فرق ہوتا ہے۔ اسے ملحوظ رکھا جائے۔

پسِ تحریر:

اس کتاب کا مسودہ اپریل 1974ء میں مکمل ہو گیا اور کتابت کے لئے بھی دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد 29 مئی کو ربوہ اسٹیشن پر واقعہ ہونے والے حادثہ اور اس کے عواقب سے' سارے ملک میں ہیجان پیدا ہو گیا اور اُمتِ محمدیہ ﷺ کے جذبات میں تلاطم برپا ہو گیا اور ہر گوشے سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ''احمدیوں'' کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو گا۔ مسلمانوں کا مطالبہ دین کا تقاضا ہے اور قرآنِ کریم کی واضح تعلیم کے عین مطابق۔ اس وضاحت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کتاب اس ہنگامی حادثہ کی پیدا کردہ نہیں (اس کا جذبۂ محرکہ دین کا وہی تقاضا تھا جسے میں چالیس سال سے پیش کرتا چلا آ رہا تھا) اس کے آخری باب میں البتہ ان مساعی کے تذکرہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو اس مطالبہ کو آئینی شکل دینے کے لئے جا رہی ہیں۔

پرویزؔ (24 جون 1974ء)

ختمِ نبوّت

ایسا بنیادی عقیدہ ہے جس کے انکار سے اسلام کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ ہمارے زمانے میں پنجاب میں ایک ایسی تحریک اُٹھی جس نے ختمِ نبوّت کے انکار اور مرزا غلام احمد کے **دعوائے نبوّت** اور **مسیحیت** سے ایک نیا مذہب ایجاد کر دیا ہمارے علماء حضرات سو برس تک "**احمدیوں**" سے مناظرے کرتے رہے لیکن اس تحریک کو ختم نہ کر سکے۔

پرویز صاحب کی معرکہ آراء تصنیف

ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیّت

نے اس باطل مذہب کی جڑ بنیاد تک کو اُکھیڑ دیا

یہ کتاب "احمدیت" کے مسئلہ پر حرفِ آخر ہے

آصف جلیل

بیادِ علامہ غلام احمد پرویز رحمہ اللہ

(یہ مضمون بزمِ لاہور کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا)

علامہ پرویزؒ کی زندگی اور قرآن کریم کے لئے ان کی خدمات کے بارے میں لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ علامہ صاحبؒ سے میری دومرتبہ مختصر سی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں ان کے بارے میں بہت کم جانتا تھا اور اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ میں کتنی عظیم شخصیت سے مل رہا ہوں۔ اس وقت میں نے ابھی قرآن کریم کو سمجھنے میں پہلا قدم ہی رکھا تھا۔ میں ان سعادت مندوں میں سے نہیں ہوں جنہیں علامہ صاحب سے ذاتی طور پر ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا اور ان کی صحبت میں وقت گزرا ہو۔ لہٰذا میں ان کی شخصیت کی بجائے ان کی علمی خدمات کے بارے میں ذکر کروں گا۔

علامہ غلام احمد پرویز رحمہ اللہ سے پہلی بار میرا غائبانہ تعارف سعودی عرب میں ایسے وقت میں ہوا جب میں نے مروجہ مذہب سے باغی ہوکر اپنی خواہشات کے تابع زندگی گزارنا شروع کیا تھا۔ اس وقت میری ملاقات میرے ایک محترم دوست سے ہوئی جو یو کے بزم کے رکن تھے اور ریاض یونیورسٹی میں انگلش پڑھانے تشریف لائے تھے اور اب یو کے میں رہائش پزیر ہیں۔ انہوں نے پرویز صاحب کا مختصر تعارف کرایا۔ اس کے بعد میں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ سعودی عرب میں پرویزؒ صاحب کی کتب دستیاب نہیں تھیں۔ میں ایک سال بعد پاکستان آتا تو ایک دو کتابیں ہی ساتھ لے کر جاسکتا تھا کیونکہ اس سے زیادہ لے کر جانے سے ضبط ہوجانے کا خطرہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے قرآن کریم کو سمجھنے میں مجھے کئی سال لگ گئے۔ کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جب ان کے ویڈیو درس سننا شروع کئے تو قرآن کریم کے حقائق مزید عیاں ہو کر سامنے آتے گئے۔ اس لحاظ سے علامہ پرویزؒ میرے محسن اور روحانی استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

علامہ پرویزؒ نے قرآن کریم کی تشریح نہایت تفصیل سے کی ہے کہ ایک ایک لفظ کے معانی عربی لغت کی رو سے کئے ہیں قرآن کریم کے متعدد حقائق سے پردہ اٹھایا ہے جنہیں مروجہ اسلام کا پرچار کرنے والوں نے نظر انداز کر رکھا ہے اور عوام کو ان سے بے خبر رکھا ہوا ہے۔ میں ان میں سے چار موضوعات کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کو سمجھ لینے کے بعد اسلام کا صحیح تصور

سامنے آ جاتا ہے اور ذہنوں میں اٹھنے والے بہت سے سوالات کا جواب مل جاتا ہے جن سے مذہبی راہنما یکسر طور پر لاعلم ہیں۔ **سب سے پہلا یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور دیا۔** سب سے زیادہ مشکل اس تصور کو قبول کرنے میں ہوتی ہے۔ مروجہ عقیدہ لوگوں کے دلوں میں اس قدر رچ بس چکا ہے کہ اس پر سوال اٹھانے سے بھی انہیں ڈر لگتا ہے۔ مروجہ تصور تضادات کا مجموعہ ہے جسے سوچنے والے ذہن قبول نہیں کرتے اور الحاد کی جانب چل پڑتے ہیں۔ پچاس سال پہلے پرویز صاحب کی بصیرتِ نگاہ نے اس کا خدشہ ظاہر کیا تھا لیکن اب یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو مروجہ تصور ہے اس میں انسان خود کوئی عمل کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں مصیبتوں سے نجات دلائے جبکہ اس نے تو ہر مشکل کا حل اپنی کتاب میں دے رکھا ہے جس کی طرف وہ توجہ نہیں دیتے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ لوگ اپنے غلط اعمال کی ذمہ داری قبول کرنے کی بجائے اس کا الزام اللہ تعالیٰ کو دیتے ہیں اور خود اپنے اعمال کی اصلاح نہیں کرتے۔ اسی سے جڑا تقدیر کا مسئلہ ہے جو پتھر پر لکیر بن چکا ہے کہ زندگی موت، امیری غریبی، مرض اور صحت وغیرہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے لکھ رکھا ہے۔ اس بارے میں سوچنا بھی منع ہے۔ یہ ایک بہت تفصیل طلب موضوع ہے جسے علامہ پرویزؒ نے اپنی دو کتابوں، من و یزداں اور کتاب التقدیر میں نہایت خوبی سے بیان کیا ہے کہ تمام شبہات دور ہو جاتے ہیں۔

دوسرا یہ تصور کہ قرآن کریم ایک اسلامی مملکت کا مکمل نظام دیتا ہے۔ تمام سیاسی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کی حدود مقرر کر دی گئی ہیں جن کے اندر رہ کر زمانے کے بدلتے تقاضوں کے مطابق قوانین بنائے جا سکتے ہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے ظالمانہ نظام میں رزق کے وہ ذرائع جو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے پیدا کئے ہیں ان پر محدود طبقے نے طاقت کے بل پر قبضہ کر رکھا ہے اور اکثریت کو اس سے محروم کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی قوانین میں دوہرا معیار رائج ہے جو طاقتور اور کمزور کے لئے الگ الگ ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ نظام سب کے لئے یکساں ہے اور کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ یہ خوف اور حزن سے پاک ماحول عطا کرتا ہے۔ لیکن اس نظام کا قیام صرف اسی صورت ممکن ہے کہ لوگوں کی بڑی اکثریت اپنے نفس میں تبدیلی لانے کے بعد اس کی بنیاد رکھیں، ورنہ شیطانی نظام مسلط رہیں گے۔ قرآنی نظام کی راہ میں مروجہ مذہبی سوچ کے علاوہ حکمرانوں کے مفادات بھی حائل ہیں۔

تیسرا مکافاتِ عمل کا تصور ہے کہ ہر عمل میں اس کا نتیجہ مضمر ہے۔ جیسا عمل ویسا ہی نتیجہ جس سے ہرگز مفر نہیں ہے۔ انسانوں کی دنیا میں یہ نتیجہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظامِ مملکت میں ہی ممکن ہے جو اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ قانون کا اطلاق سب پر یکساں طور پر ہو اور کسی پر ظلم نہ ہو۔ مروجہ مذہبی عقیدے میں معافی گناہوں کی معافی کا تصور دیا جاتا ہے جس سے انسان جرم کرنے کے بعد دلی طور پر مطمئن ہوتا ہے کہ معافی مل جائے گی۔ ظاہر ہے اس سے جرائم کی روک تھام کرنا ممکن نہیں ہے اسی لئے انسانوں کی دنیا میں طاقتور غلط اعمال کے نتائج سے بچ جاتا ہے اور کمزور ظلم کا نشانہ بنتا رہتا ہے۔

چوتھا تصور ذات کی نشوونما کا ہے جس کا تعلق مکافاتِ عمل سے بھی ہے اور اُخروی زندگی سے بھی۔ اس کے تحت ہر انسان

کو پیدائش کے وقت جسم کے علاوہ ایک اور شے ملتی ہے جسے اس کا نفس یا ذات کہا جاتا ہے۔ جسم کی پرورش طبعی قوانین کے ماتحت ہوتی ہے جس کے لئے مناسب غذا اور صحت کے اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ ذات کی نشوونما اللہ کی ہدایت پر عمل کرنے سے ہوتی ہے، اور اس کی خلاف ورزی سے کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کا براہ راست تعلق ریاستی نظام سے نہیں ہے نہ اس میں انسانی مداخلت ہوسکتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے خودکار نظام کے ماتحت جاری وساری ہے۔ انسانوں کے نظام میں اگر کوئی شخص جرم کر کے بچ بھی جائے تو اس کی ذات پر اس کا منفی اثر پڑ جاتا ہے۔ انسانی ذات طبعی موت سے نہیں مرتی بلکہ وہ زندگی کے اگلے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے احتساب کا عمل رکھا ہوا ہے جو اچھے یا برے عمل کو میزان عدل میں ڈال کر انسانی ذات کے لئے اگلے مرحلے کی اہلیت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے مطابق، جس کے اچھے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا وہ اگلے جنتی مرحلے کا حقدار بن جائے گا۔ اور جس کے غلط اعمال کا پلڑا جھکا ہوگا وہ جہنمی زندگی بسر کرے گا۔

میرے علامہ دوسرے ہزاروں لوگوں کے لئے علامہ پرویزؒ بہت بڑے محسن ہیں کہ انہوں نے قرآن کریم کے ان حقائق سے روشناس کرایا جن سے انسانوں کو درپیش مسائل کا حل کرنے میں راہنمائی ملتی ہے۔ حق کے متلاشی ذہنوں کے لئے انہوں نے متعدد کتابیں اور مقالات لکھے ہیں جن سے قرآن کریم کو سمجھنے میں نہایت آسانی ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہزاروں گھنٹوں پر محیط آڈیو اور ویڈیو دروس کے علاوہ خصوصی لیکچرز بھی ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنا اتباع کرانے کی دعوت نہیں دی نہ خود کو حرف آخر قرار دیا ہے بلکہ جو کچھ انہوں نے پیش کیا ہے اسے غور وفکر کے بعد قبول کرنے کے لئے کہا ہے۔

قرآن کریم کو سمجھ لینے کے بعد بہت بڑی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ ان اقدار پر عمل پیرا ہوں جن پر انفرادی طور پر عمل کیا جا سکتا ہے اور جو اسلامی مملکت کے قیام سے مشروط نہیں ہیں۔ انہیں عام طور پر اخلاقی اقدار کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے علامہ پرویزؒ کی کتاب اسلامی معاشرت ہر چھوٹے بڑے کے لئے بہت مفید ہے اور اس سے خود احتسابی میں بھی مدد لی جا سکتی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کہاں کمی رہ گئی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ الگ الگ گروہوں میں بٹ جانے کی بجائے ایک مرکز کے تحت یکجا ہو جائیں جو صرف تحریک طلوع اسلام فراہم کرتی ہے۔ علامہ پرویزؒ کا یوم وفات منانے کے پیش نظر بھی یہی ہونا چاہئے۔

آپ سب کا شکریہ۔

سید حیات النبی رضوی، کراچی

یکم مئی

قرآن کریم کی رُو سے ہر انسان محنت کش ہے

یکم مئی 1886ء کو ''ھے مارکیٹ اسکوائر'' شکاگو امریکہ میں ایک بڑا حادثہ رونما ہوا جس کا اثر نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا پر پڑا۔ ایک صنعتی پلانٹ کے مزدوروں نے پولیس ایکشن کے خلاف ہڑتال کی اور مذکورہ بالا اسکوائر پر جمع ہوئے، اجتماعی اجلاس کے آخر میں کسی نامعلوم شخص نے بم کا دھماکہ کر دیا۔ بہت سے لوگ اور آٹھ پولیس والے بھی مارے گئے۔ متعلقہ حکام نے اس پر تشدد مظاہرہ کا سارا الزام مزدوروں پر ڈال دیا اور آٹھ مزدور لیڈروں کو اس الزام میں گرفتار کر لیا جبکہ یہ الزام کسی طور بھی ثابت نہ ہو سکا تھا کہ یہ مزدور لیڈر بم سازش میں شریک تھے۔ ان میں سے سات کو موت کی سزا سنائی گئی اور آٹھویں کو قید کیا گیا۔ سات میں سے چار کو پھانسی دے دی گئی اور ایک نے خودکشی کو فوقیت دی اور بقیہ دو کی موت کی سزا قیدِ سخت میں تبدیل کر دی گئی۔ یہ تین قیدی 1893ء میں ''الی نائیز'' کے گورنر جان آلٹ گیلڈ کے زمانے میں رہا کر دیئے گئے۔ مگر یہ تحریک یہیں ختم نہیں ہو گئی بلکہ ان مزدوروں کے خون نے رنگ لانا شروع کیا اور 1889ء میں ورلڈ سوشلسٹ پارٹیز کانگریس نے ہیرس میں امریکہ کی مزدوروں کی تحریک کا ساتھ دیتے ہوئے مزدوروں کے لئے آٹھ گھنٹے یومیہ کام کا مطالبہ کیا، انہوں نے یکم مئی 1890ء کا دن اپنی تحریک کے بھرپور مظاہرہ کے لئے منتخب کیا۔ اس کے بعد تو بہت سے ممالک میں یکم مئی مزدوروں کے دن کے طور پر منایا جانا شروع ہو گیا۔ بڑے بڑے جلسے، مظاہرے اور سیمینار بلکہ محنت کشوں کی پریڈ کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ یہ دن امریکہ میں ستمبر کی تحریک کے مماثل بھی سمجھا جاتا ہے جب 1882ء میں اول اول آٹھ گھنٹے یومیہ کام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ حکومتوں اور مزدور تحریکوں نے متفقہ طور پر یکم مئی کو مزدوروں کے دن کے طور پر تسلیم کر لیا اور اس دن عام تعطیل ہونے لگی، اس دن دنیا کے مزدوروں کے سلسلے میں تقاریر اور دیگر تقاریب کا اہتمام ہونے لگا۔ اگرچہ یہ واقعہ تو شکاگو امریکہ میں وقوع پذیر ہوا تھا مگر بالشویک روس اور دنیا کے دیگر سوشلسٹ و کمیونسٹ ممالک میں اس کی بازگشت بڑی تیز آواز کے ساتھ سنی گئی اور اس دن کو بڑے شایانِ شان طریقے سے منایا جانے لگا۔ پاکستان میں بھٹو صاحب کے زمانے میں اس دن کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور یہ ایک عام تعطیل کا دن تھا مگر اب مرکزی سرکاری حکومت کی طرف سے یہ تعطیل ختم کر دی گئی

ہے۔

جہاں جہاں یکم مئی مزدوروں کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے اس کے مظاہروں سے ایک بات کا بڑے بیّن طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہ اُن محنت کشوں کا دن ہے جو فیکٹریوں' کارخانوں اور مِلوں میں جسمانی محنت ومشقت کا کام انجام دیتے ہیں' ان مظاہروں میں مزدوروں کی ٹریڈ فیڈریشنیں' مزدور انجمنیں اور عام جسمانی محنت کش بھرپور طریقے سے شرکت کرتے ہیں اور معاشرے میں بھی یہ بات حقیقتِ ثابتہ کی طرح تسلیم کر لی گئی ہے کہ یہ مزدوروں کا دن ہے اور مزدور وہی ہوتا ہے جو جسمانی محنت ومشقت کے کام انجام دیتا ہے۔ سوشلسٹ روس نے بھی جب مزدوروں کی اور کسانوں کی حکومت کا نعرہ دیا تو اپنے سرخ پرچم کے لئے درانتی اور ہتھوڑے کا نشان پسند کیا' گویا مزدور سے مراد کھیت مزدور اور فیکٹریوں میں جسمانی مشقت انجام دینے والے انسان تھے۔ اگر ہم کسی لغت کو اٹھا کر دیکھیں تو وہاں بھی یہ نکتہ کارفرما نظر آتا ہے کہ مزدور کے بنیادی معنی میں جسمانی محنت ومشقت بنیادی عنصر ہے۔ مزدور کا لفظ دراصل دو لفظوں کا مرکب ہے' مُزد + وَر جس کے معنی محنت مزدوری کا معاوضہ حاصل کرنے والا ہیں۔ فارسی لفظ مُزد کے معنی مزدوری' اجرت' طلبِ تنخواہ' صلہ اور بدلہ کے ہیں۔ اسی لئے مزدور کے معنی مزدوری کرنے والا یا اجرت پر کام کرنے والے کے ہیں۔ مزدوری کے معنی لغت میں کام کا معاوضہ' محنت کا صلہ' مشقت اور محنتانہ دیئے گئے ہیں جبکہ مزدوری کرنے کے معنی محنت مشقت کا کام کرنا ہیں۔

اس تمام بحث سے ہماری مراد یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں مزدور یا اس کا ہم معنی لفظ بولا جاتا ہے اس سے انسانوں کا وہ گروہ مراد ہے جو جسمانی محنت ومشقت انجام دیتا ہو' خواہ وہ زمین کو پھاوڑے اور گیتی سے کھودتا ہو' فیکٹری یا کارخانے میں کام کرتا ہو' کھیت مزدور ہو یا مشینوں پر انتہائی محنت ومشقت کے ساتھ خدمات انجام دیتا ہو۔ یورپ اور امریکہ میں ایسے لوگوں کے لئے ''نیلے کالر'' والوں کی اصطلاح عام ہے۔ جو لوگ دفاتر' مدارس یا دیگر تجارتی وعلمی کام انجام دیتے ہیں وہ الگ گروہ شمار ہوتے ہیں اور ''وہائٹ کالر'' والوں کے زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یکم مئی کے موقع پر جو ترانے اور گیت ریڈیو' ٹیلی ویژن سے نشر کئے جاتے ہیں وہ بھی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں۔

مزدور کے ماتھے پر محنت کا پسینہ ہے ہر قطرہ ہے اک موتی' ہر موتی نگینہ ہے

گویا مزدور وہی ہے جو پسینہ بہا کر محنت ومشقت کی خدمات انجام دے رہا ہے اور اس گروہ میں وہ انسان ہرگز شامل نہیں ہیں جو حکیم' ڈاکٹر' اساتذہ یا سائنسدان وغیرہ ہیں۔

اس کے علاوہ ایک خیال آفرینی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ مزدوروں کا یہ طبقہ معاشرہ میں کمتر حیثیت کا حامل ہے جبکہ دوسرے طبقات اعلیٰ وارفع درجات رکھتے ہیں۔ یوں تو محنت کی عظمت کے گن گائے جاتے ہیں' کہا جاتا ہے کہ حضورؐ اپنی جوتیاں خود گانٹھ لیا کرتے تھے' جنگِ خندق میں عام مزدوروں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور مزدور کی مزدوری اس کے

پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرنے کا حکم بھی آپؐ ہی کا ہے مگر ان تمام لن ترانیوں کے باوجود پرنالہ وہیں گرتا ہے کہ بندہ کوچہ گردی ہی کرتا رہتا ہے اور خواجہ بلند بام سے اترنے کا نام نہیں لیتا۔ مزدور کی حیثیت معاشرے میں ڈھکی چھپی نہیں' ہمارے ہاں کمی کمین کے الفاظ اس بات کی بھرپور غمازی کر رہے ہیں کہ ہاتھ سے کام کرنے والا کیا مقام رکھتا ہے' اس کے بیٹھنے کی جگہ کیا ہے' اسے دیگر لوگوں سے بات چیت کرنے کے لئے کن آداب کا خیال رکھنا ہوتا ہے' اس کے رشتے ناطے کن لوگوں سے ہو سکتے ہیں بلکہ یہاں تک کہ اس کے خیال کی پرواز کیا ہونی چاہئے' بقول پرویزؔ صاحب کے کہ نماز تو محمود و ایاز ساتھ ہی مساوات کے ساتھ ادا کرتے ہیں مگر نماز کے بعد ایاز نے محمود کے جوتے اٹھائے اور پیچھے پیچھے چل پڑا' گویا ہر شخص کی ایک حیثیت مقرر ہے' آقا آقا ہے' مزدور مزدور ہے۔ بال جبریل میں علامہ اقبال نے لینن کی زبانی ''اللہ سے شکوہ'' کہلوایا ہے جس سے درج بالا کیفیات کا بھرپور اندازہ ہو جاتا ہے۔ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اس بالِ جبریل میں علامہ فرماتے ہیں ؎

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

بندہ و آقا کی یہ تفریق' محنت و مشقت کرنے والے اور دیگر امور انجام دینے والے گروہوں میں یہ زمین و آسمان کا بعد اور معاشرہ میں ہر اس شخص کو بری نظر سے دیکھنے کا رواج جو جسمانی محنت و مشقت کرتا ہو اور ہر اس شخص کی عزت کا تصور جو کم از کم محنت کرتا ہو بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ سب سے زیادہ عزت اس کی ہوتی ہے جو کچھ نہ کرتا ہو بلکہ عیش کی کھاتا ہو۔ جاگیردار' خوانین' وڈیرے اور سرمایہ دار اگر کچھ نہ کرتے ہوں صرف حقہ گڑگڑاتے' اپنے کمی کمینوں پر احکامات صادر کرتے نظر آئیں تو ان کو حد درجہ قابل عزت' پرشکوہ اور قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ اگر ان باتوں کا بغور مطالعہ کیا جائے اور تجزیہ کیا جائے تو جو بات نکھر اور ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ محنت کرتے ہیں اور بعض لوگ نہیں کرتے اور معاشرہ نے ان گروہوں کی عزت و تکریم کے اپنے معیار بنا لئے ہیں۔ نیز یہ کلیتہً سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر شخص کے لئے محنت کرنا ضروری نہیں' جس قدر محنت سے دور ہوں گے اسی قدر لائق احترام۔ یہ سب انسانوں کا خود ساختہ نظام ہے جس کی سزا مختلف گروہ بھگت رہے ہیں۔

اس ضمن میں اور اس موڑ پر فکر کا تقاضا ہے کہ دیکھا جائے کہ قرآن کریم کیا رہنمائی کرتا ہے اور اس کی تعلیمات کیا ہیں' کیا وہ ان نظریات سے متفق ہے یا اس کی اپنی کوئی راہ ہے۔ محنت کے موضوع پر قرآن کریم کی 53 ویں سورت النجم کی 39 ویں آیت ایک ایسی چمکتی ہوئی روشن راہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے تمام معاملہ بالکل صاف' نکھر اور

ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور تمام اشکال حل ہو جاتے ہیں' ارشاد ہے :وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ (53:39) جس کے معنی ہیں کہ انسان کو اس کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوسکتا جس کے لئے اس نے محنت نہ کی ہو' گویا وہ صرف محنت کے ماحصل ہی کا حقدار ہے گویا:

قرآنِ کریم کی رُو سے ہر انسان محنت کش ہے:

یہ آیۂ کریمہ تمام انسانی گروہ کا رتبہ' درجہ اور ان کی حیثیت متعین کر دیتی ہے اور معاشرہ کی اس تفریق کے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے جس نے محنت و مشقت کی بنیاد پر انسانوں کو گروہوں میں بانٹ رکھا تھا' ہر انسان پر ماسوا بچوں اور معذوروں کے محنت کا فریضہ از بس ضروری ہے اور وہ اپنی زندگی گزارنے کے لئے جو دولت یا اثاثہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے اسے محنت کرنی ہوگی' بغیر محنت کئے اس کا کسی چیز پر حق نہیں۔ جب معاشرہ میں ہر شخص محنت کا پابند ہوگا تو ہر شخص محنت کش ہوگا' ہر شخص ''مزدور'' ہوگا اور اس طرح یکساں عزت کا حقدار ہوگا۔ معاشرہ میں یقیناً درجات ہوں گے مگر وہ اختلاف افعال کی وجہ سے ہوں گے' لوگوں کا مختلف اشغال کی طرف مائل ہونا اور مختلف پیشے اختیار کرنا بھی اللہ کی رحمت ہے ورنہ مختلف امور کا انجام پانا اور لوگوں کے اذواق کا مختلف نہ ہونا معاشرہ میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ سورۃ الزخرف جو قرآن کریم کی 43ویں سورت ہے اس کی آیت 32 ملاحظہ فرمائیے:

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ (43:32)۔

(ترجمہ) کیا یہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت کو بانٹتے ہیں؟ ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔

اب اگر محولہ بالا دونوں آیات کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انسان کا تعلق خواہ کسی گروہ سے ہو یعنی خواہ وہ جسمانی محنت و مشقت کرتا ہو چاہے اس کا ذریعہ آمدنی ذہنی کاوش ہو' ہر دو ذرائع میں محنت کا عنصر قدر مشترک ہوگا' اگر حصول زر کا کوئی ایسا ذریعہ تلاش کیا گیا ہے جس میں محنت موجود نہیں تو وہ اللہ کی نظر میں جائز نہیں اور ایسے ذریعہ سے اجتناب ضروری ہے۔ زندگی گزارنے کے لئے جو ذرائع آمدنی اختیار کئے جاتے ہیں ان کو عمومی طور پر پانچ طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے جو درج ذیل ہیں۔

(1) عطیہ: کوئی شخص کسی کو کوئی چیز ہدیہ کر دے مگر اس میں لین دین کا معاملہ نہیں ہوتا۔

(2) اجرت: محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اس میں سرمایہ کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(3) ربوٰ: دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زائد وصول کیا جاتا ہے' سرمایہ دینے والا محنت نہیں کرتا بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کرتا ہے۔

(4) منافع: تجارت میں حاصل ہوتا ہے جس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(5) قمار: قمار و میسرہ (جوئے) میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے عطیہ، اجرت اور منافع حلال جائز ہیں جبکہ ربوٰ اور قمار کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ عطیہ میں تو چونکہ لین دین کا معاملہ ہوتا ہی نہیں اس لئے اس میں کسی قسم کی گفتگو کی زیادہ ضرورت نہیں البتہ جن دو چیزوں (اجرت اور منافع) کو جائز قرار دیا گیا ان میں محنت کا عنصر موجود ہے۔ اور جن دو چیزوں کو حرام قرار دیا گیا (ربوٰ اور قمار) ان میں محنت سرے سے موجود نہیں۔ گویا محنت ہی وہ رکنِ رکین ہے جو ذرائع آمدنی اور ہمارے نظامِ اقتصاد کی جڑ ہے، اصل و بنیاد ہے۔ اس موقع پر اگر اس بات کی بھی وضاحت کر دی جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ قرآنِ کریم کی رو سے جہاں ہر گروہ کے لئے محنت کا عنصر ضروری قرار دیا گیا ہے وہاں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔ سورۃ النساء کی 32 ویں آیت میں واضح کر دیا گیا کہ:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ (4:32)۔

(ترجمہ) اور جس چیز میں خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اس کی ہوس مت کرو۔ مردوں کو ان کاموں کا اجر ہے جو انہوں نے کئے اور عورتوں کو ان کاموں کا اجر ہے جو انہوں نے کئے۔

ہم نے اوپر سورہ النجم کی 39 ویں آیت کا جو حوالہ دیا ہے وہی ہمارے نظامِ اقتصاد کا قبلہ بھی متعین کرتی ہے۔ ہمارے ماہرین اقتصادیات جن کو اصلاً بوجھ بجھکڑ کہنا چاہئے وہ عوام الناس کو شراکت اور مضاربت جیسی اصطلاحات سے مرعوب کر کے موجودہ سودی بنکاری نظام کو مشرف بہ اسلام کرنے کے چکر میں لگے رہتے ہیں حالانکہ ان اصطلاحات کا تعلق دور کا بھی قرآن کریم سے نہیں ہے بلکہ حقیقتاً جن نظریات کا یہ پرچار کرتی ہیں وہ قرآن کریم کے نقیض ہیں، یہ اصطلاحات مسلمانوں کے دور ملوکیت کی پیداوار ہیں۔ یہ ماہرین اقتصادیات ایک نکتہ بڑے فخر کے ساتھ بیان فرماتے ہیں کہ اسلامی بنکاری میں منافع (سود) متعین نہیں ہوگا اور اس طرح یہ شیر مادر کی طرح حلال ہو جائے گا۔ یہ حضرات اگر ذرا سا اس بات پر غور کر لیتے کہ قرآن کریم نے سورہ بقرہ کی 275 ویں آیت میں اس بات کی تشریح کر دی ہے کہ تجارتی منافع اور ربوٰ (سود) ایک جیسے نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ربوٰ کو حرام اور تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔ تجارتی منافع کو حلال کیوں قرار دیا اور سود کو حرام کیوں قرار دیا گیا، یہ بات بالکل واضح ہے کہ تجارت میں سرمایہ ضرور لگایا جاتا ہے مگر اس میں محنت بھی کی جاتی ہے اور دراصل یہ منافع اسی محنت کا ہوتا ہے، ہمارے بزرگ ''آٹے میں نمک'' کی بات ایسے موقع پر اسی لئے کہتے تھے۔ اب تجارت میں سرمایہ کا منافع (سود) بھی شامل کر لیا گیا ہے اور محاورہ الٹ گیا ہے یعنی ''نمک میں آٹا'' منافع ہونے لگا ہے۔ رہی بات ربوٰ کی تو اس کو اس لئے حرام قرار دیا گیا اور اسے تجارتی منافع کے غیر مماثل قرار دیا گیا کیونکہ اس میں محنت کا عنصر مفقود ہوتا ہے اور یہ سرمایہ پر بڑھوتری

ہوتی ہے جو ناجائز ہے۔ احادیث و روایات میں ایسی امثال بکثرت موجود ہیں جو شراکت و مضاربت کی نفی کرتی ہیں۔ صحاح ستہ کی ایک روایت حضرت رافع بن خدیج ؓ سے مروی ہے کہ:

''میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور مہیر) سے سنا جبکہ وہ دونوں اپنے محلہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے ممانعت فرمادی ہے۔''

یہی راوی اپنے ماموں سے نقل کرتے ہیں۔

''میرے ماموں ایک دن آئے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی بات سے منع فرمادیا ہے جو تم لوگوں کے لئے زیادہ نفع بخش تھی مگر اللہ اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری ہمارے اور تمہارے لئے کہیں زیادہ نفع بخش ہے۔ رسول اللہ صلعم نے تہائی اور چوتھائی پر اور کرایہ پر زمینیں دینے سے بالکل منع فرمادیا ہے۔'' (کنز العمال)

جابر بن عبداللہ ؓ سے بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ: ''جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو بخش دے یا اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دے۔''

ان احادیث و روایات سے بھی اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ ذرائع آمدنی کے لئے از خود محنت کی ضرورت ہے۔ دوسرے کی محنت پر آکاس بیل بن کر گزارہ کرنا حرامِ قطعی ہے اور ناجائز۔ محنت ہی وہ ذریعہ ہے، وہ عنصر ہے جو ہماری آمدنی کا واحد منبع و مخرج ہے اور اسی میں عظمت ہے۔ ہر شخص اپنا ذریعہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے چونکہ محنت پر مجبور ہے اس لئے ہر انسان از روئے قرآن کریم محنت کش ہے اور مزدور ہے خواہ وہ کسی قسم کی بھی محنت کرتا ہو، جسمانی یا دماغی۔ اسی نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے راقم الحروف علامہ اقبال کے وہ اشعار نقل کرتا ہے جو انہوں نے خضر سے سوال جواب کی صورت میں بیان کئے ہیں۔ خضر سے سوال کیا گیا:

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

خضر کا جواب ملاحظہ فرمائیے:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ادارہ

باب المراسلات

1۔سورۃ القریش کی اہمیت۔۔۔قیامِ نظامِ اسلامی کی بنیادی شرائط:

ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ قرآن مجید کے آخری پارہ کی آخری چھوٹی چھوٹی سورتوں میں سے، سورۃ القریش کی معنویت سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآنِ مجید کی دعوت عالمگیر بھی ہے اور ابدی بھی، لیکن اس سورۃ کا تعلق زمانہ نزولِ قرآن کے (قبیلۂ) قریش سے ہے۔ جو کچھ اس سورۃ میں کہا گیا ہے، وہ ان کے ساتھ ختم ہو گیا۔ بعد میں آنے والے عالمِ انسانیت کے لئے اس میں کیا تعلیم اور کیا پیغام ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔

طلوعِ اسلام:

ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو اس سورۃ میں ایسا پیغام ملے گا جو عالمگیر بھی ہے، اور ابدی بھی، بلکہ اگر کہا جائے کہ وہ اسلامی نظام کی خشتِ اوّل ہے تو قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔

زمانہ نزولِ قرآن میں، عربی معاشرہ کی یہ حالت تھی کہ ان کی کوئی چیز محفوظ نہیں رہتی تھی۔ ان کے مساکن میں ڈاکے پڑتے تھے اور ان کے قافلے سرِعام لوٹے جاتے تھے۔ لیکن اس میں قریش کی استثنیٰ تھی۔ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے، دیگر قبائل، اور ہمسایہ ممالک میں وہ بڑے احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، اور انہوں نے ان سے ایسے عہد و پیمان کر رکھے تھے جن کی رُو سے ان کے قافلے ہر جگہ محفوظ رہتے تھے۔ اور ان کے گھر بار بھی مامون۔ اس بنا پر وہ بڑے امن اور مرفہ الحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۚ﴿۲﴾ (106:1-2)۔ یعنی الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۬ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۧ﴿۴﴾ (106:4)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھوک سے بھی محفوظ رکھا تھا اور ڈر خطرے سے بھی مامون۔ یہ تھی قریش کی حالت ___ فارغ البالی اور بے خوفی۔

اس کے بعد وہ نکتہ سامنے آتا ہے جسے ہم نے اسلامی نظام کی خشتِ اوّل کہا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ جب انہیں روٹی کی بھی فکر نہیں اور امن بھی نصیب ہے، تو اس کے بعد ان کے پاس کونسا عذر باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اس نظام کو قائم نہ کریں جس کا مرکز خدا کا یہ گھر (کعبہ) ہے۔ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۙ﴿۳﴾ (106:3) اس میں (فا) بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی

ہیں کہ جب یہ دونوں شرائط پوری ہوگئی ہیں تو پھر یہ اس نظام کو کیوں قائم نہیں کرتے؟

اس میں عالمگیر پیغام یہ ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے بنیادی شرائط یہ ہیں کہ قوم بھوک اور خوف سے محفوظ اور مامون ہو۔ خود خدا نے قریش کو اس نظام کے قیام کی دعوت یہ کہہ کر دی تھی اور انہیں اس کے قیام کا مکلف ٹھہرایا تھا کہ جب یہ دونوں شرطیں پوری ہو چکی ہیں تو پھر تم یہ نظام کیوں نہیں قائم کرتے؟

سورۃ النحل میں ہے کہ خدا تمہیں یہی بات ایک مثال کے ذریعے سمجھاتا ہے۔ ایک بستی تھی جو امن واطمینان سے رہتی تھی اور اسے رزق کی طرف سے بھی بے فکری تھی۔ انہوں نے کفرانِ نعمت کیا۔۔۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ۔۔۔ تو اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا کر دیا (16:112)۔

اس مثال سے واضح ہے کہ بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہے، اور ظاہر ہے کہ جو قوم خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو وہ نظامِ خداوندی قائم کر نہیں سکتی۔ ایسی قوم کو نظامِ خداوندی کے قیام کی دعوت دینا اور توقع کرنا کہ اس میں یہ نظام قائم ہو جائے گا، خود خدا کے پروگرام کے خلاف ہے۔ وہ اسی قوم کو اس کا مکلف قرار دیتا ہے جو بھوک کی طرف سے بے فکر اور خوف وخطر سے مامون ہو۔ حضور ﷺ نے اس نکتہ کی تشریح ان الفاظ میں فرمادی تھی کہ جس بستی میں کوئی ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو گیا اس سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

یہ ہے سورۃ القریش کا عالمگیر اور ابدی پیغام۔

2۔ حفظِ قرآن یا ناظرہ قرآن:

سوال: رمضان شریف کی تراویح میں قرآنِ مجید ختم کیا جاتا ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ نہ امام کو اس کا علم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کی جو آیات وہ پڑھ رہا ہے ان کا مطلب اور مفہوم بلکہ معنی کیا ہیں، نہ ہی سامعین کو اس کا علم ہوتا ہے۔ امام، قرآنِ کریم کے الفاظ دہراتا چلا جاتا ہے اور مقتدی ان الفاظ کو سنتے جاتے ہیں، بغیر سمجھے! سوال یہ ہے کہ کیا اس سے قرآنِ کریم کا وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے جس کے لئے اسے نازل کیا گیا تھا۔

بات تراویح میں ختمِ قرآن تک محدود نہیں۔ ہماری مسجدوں اور مذہبی مدرسوں۔۔۔ میں بھی قرآنِ مجید ناظرہ پڑھایا جاتا ہے۔ یعنی قرآن مجید کے الفاظ پڑھائے جاتے ہیں، بلا مطلب، اور ہمارے گھروں میں۔۔۔ (جہاں جہاں ابھی یہ روش باقی ہے) قرآن شریف ناظرہ ہی پڑھایا جاتا ہے۔ اس پر کچھ روشنی ڈالئے؟

جواب: یہ بات اس قدر روشن ہے کہ اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ قرآنِ کریم نے، اپنی پہلی سطر میں اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ۔۔۔ (2:2)۔ یہ کتاب ہے۔ اسے ذہن میں رکھیئے کہ قرآنِ مجید ایک کتاب ہے۔

کیا آپ نے کبھی یہ دیکھا، یا سنا ہے کہ کوئی شخص ایسی کتاب پڑھ رہا ہو جس کی زبان وہ نہیں جانتا۔ جس کے الفاظ کے معنی

وہ نہیں سمجھتا! زبان نہ جاننا تو ایک طرف، اگر کوئی ایسی کتاب ہو جس کی زبان مشکل ہو تو آپ یہ کہہ کر اُسے رکھ دیتے ہیں کہ یہ کتاب مشکل ہے، میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر اس کتاب کی کچھ اہمیت ہے تو آپ کوشش کر کے اتنی استعداد پیدا کرتے ہیں کہ آپ اسے سمجھ سکیں۔ بہرحال آپ کسی کتاب کو نہیں پڑھتے جب اس کے معانی اور مطلب آپ سمجھ نہ سکیں۔

آپ دنیا کی کسی کتاب کے ساتھ ایسا نہیں کرتے۔ ایسا کرتے ہیں تو صرف خدا کی اس کتاب کے ساتھ! خدا کی یہ کتاب، الہدیٰ ہے۔ یعنی یہ زندگی کی ہر شاہراہ پر آپ کی راہنمائی کرتی ہے۔ یہ ضابطۂ قوانین ہے۔ اس میں وہ نسخے درج ہیں جو آپ کی ہر نفسیاتی مرض کے لئے شفا کا حکم رکھتے ہیں۔ یہ آپ کو زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے۔ یہ آپ کی اس دنیا کو بھی حسین اور شاداب بناتی ہے اور عاقبت بھی سنوارتی ہے۔ کیا یہ مقاصد اس کتاب کو سمجھے بغیر حاصل ہو سکتے ہیں؟ اس کے نازل کرنے والے نے خود ہی اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (12:2 ز 43:3)۔ ہم نے اس قرآن کو واضح عربی زبان میں اس لئے نازل کیا ہے کہ تم اسے سمجھ سکو۔ لفظ ''عربی'' عربی زبان کے لئے بھی بولا جاتا ہے، اور اس کے معنی ''واضح'' کے بھی ہیں۔ اسے دوسری جگہ: بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝۱۹۵ (26:195) بھی کہا گیا ہے۔ صاف، واضح زبان میں۔ پھر آپ قرآن میں دیکھئے۔ جگہ جگہ تدبر، تفکر، تعقل، یعنی اس میں غور و فکر کرنے۔ اسے علم و بصیرت کی رُو سے سمجھنے کی تاکید آئی ہے؟ کیا یہ مقصد اس کے الفاظ کو (بلا معنی و مطلب) دہرانے سے حاصل ہو سکتا ہے؟ جہاں تک بلا سمجھے کتاب کے الفاظ کو دھراتے رہنے کا تعلق ہے قرآنِ کریم نے یہودیوں کے خلاف یہ کہہ کر اعتراض کیا تھا کہ: وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ ۔۔۔ (2:78)۔ اس کا ترجمہ تفسیر ابن کثیر کے مترجم، (مولانا) محمد جونا گڑھی (مرحوم) ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ان میں سے بعض اَن پڑھ ایسے بھی ہیں جو کتاب کے صرف ظاہری الفاظ کو ہی جانتے ہیں''۔ قرآنِ کریم نے، بلا سمجھے کتاب کے الفاظ دہرانے کو یہودیوں کی روش بتایا ہے اور اسے قابلِ اعتراض قرار دیا ہے۔ ہمارے بعض مترجمین نے لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ ۔۔۔ کے معنی یہ کئے ۔۔۔ ہیں کہ یہ لوگ، کتاب کو سمجھتے نہیں اور اپنی خوش عقیدگی میں مگن رہتے ہیں۔ کتاب کے الفاظ کو بلا سمجھے اسی صورت میں دھرایا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی خوش عقیدگی میں مگن رہے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ قرآن ایک کتاب ہے جسے بلا سمجھے پڑھنے سے اس کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن حفظ کرنے سے اس کی حفاظت کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ جس زمانے میں طباعت کا انتظام نہیں تھا، حفظ کرنا حفاظتِ قرآن کا ایک ذریعہ ضرور تھا۔ لیکن اس زمانے میں جب طباعت اور نشر و اشاعت کے اس قدر وسیع وسائل اور انتظامات موجود ہیں، حفاظتِ قرآن کے لئے اس کے حفظ کرنے کی اتنی اہمیت نہیں رہی۔ لیکن ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآن حفظ نہ کیا جائے۔ ہم کہہ یہ رہے ہیں کہ قرآن کو بلا سمجھے نہ (ناظرہ) پڑھا جائے، نہ حفظ کیا جائے۔ قرآن کا سمجھنا، اس کے مقصد کے حصول کا بنیادی ذریعہ ہے۔ صدرِ اوّل میں جنہوں نے قرآن حفظ کیا تھا (اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ ان میں شاید ہی

کوئی ایسے ہوں جنہیں قرآن کم وبیش حفظ نہ ہو) تو ان کی زبان عربی تھی' اس لئے وہ جو کچھ حفظ کرتے یا پڑھتے تھے اسے سمجھتے بھی تھے۔ ہم تو اپنی بات کر رہے ہیں کہ ہماری زبان عربی نہیں اور ہم بلا سمجھے قرآنِ مجید کے الفاظ دہرا لینے سے اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ اس کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ ہماری اس خوش فہمی نے اُمت کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم، قرآن کے محفوظ ہونے کے باوجود، اس کی راہنمائی سے محروم ہیں۔ جس کتاب سے راہنمائی نہ حاصل کی جائے اس کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ قیامت میں حضور نبی اکرم ﷺ خدا سے شکایت (یا فریاد) کریں گے کہ وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ (25:30) ''اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔'' کتاب کو چھوڑ دینے میں دونوں شکلیں شامل ہیں۔ کتاب کو بلا سمجھے پڑھتے رہنا۔ یہ بھی اسے چھوڑ دینے کے مترادف ہے اور اسے سمجھ کر اس پر عمل نہ کرنا، یہ بھی اسے چھوڑ دینا ہے۔ اگر اسے سمجھا ہی نہ جائے تو اس پر عمل کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ عمل کرنے کا اوّلیں زینہ اسے سمجھنا ہے۔ قوم کو جو مطمئن کرا دیا گیا ہے کہ اس کے بلا سمجھے پڑھنے سے ثواب ہوتا ہے، تو اسے سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت کی طرف اس کا ذہن منتقل نہیں ہونے پاتا۔ اگر ہم اس کے ذہن میں یہ حقیقت راسخ کر دیتے۔۔۔ کہ قرآنِ کریم کو سمجھ کر پڑھنے ہی سے اس کا مقصد حاصل ہوتا ہے تو پھر وہ بلا سمجھے۔۔۔ پڑھنے پر مطمئن ہو کر بیٹھ نہ جاتی۔ جس قدر انتظامات قرآن کو بلا سمجھے پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے کے لئے کئے جاتے ہیں' اگر اس کا عشر عشیر بھی اس کے سمجھنے سمجھانے کے لئے کیا جاتا، تو ہماری حالت کچھ کی کچھ ہو جاتی۔ لیکن ہم شاید اسی میں اپنی بچت سمجھتے ہیں کہ قرآن کو سمجھنے کی طرف قوم کا ذہن منتقل نہ ہونے پائے۔ اس لئے کہ قرآن کا بے نقاب ہونا ؎

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے نے کوئی فغفور و خاقاں' نے فقیرِ رہ نشین

اس لئے خیریت اسی میں ہے کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے

قوم کو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں مَست رکھنے کی مؤثر ترین صورت یہ ہے کہ اسے یقین دلا دو کہ قرآن کے الفاظ دہراتے رہنے سے ثواب ہوتا اور خدا کے ہاں سے اس کا اجر ملتا ہے۔

———.....———

اُمت میں اتحاد:

سوال: اگلے دنوں کوئی صاحب ٹیلیویژن پر ایک تقریر کے دوران کہہ رہے تھے کہ قرآنِ مجید اُمت میں اتحاد کا تقاضا کرتا ہے۔ مجھے تو قرآن میں اتحاد کا لفظ تک نہیں ملا۔ کیا اس کی وضاحت فرمائیں گے کہ قرآنِ مجید کا تقاضا کیا ہے؟

جواب: آپ نے صحیح سمجھا ہے۔ قرآنِ مجید میں اتحاد (یا متحد وغیرہ) کے الفاظ نہیں ہیں۔ نہ ہی وہ اُمت سے اتحاد کا تقاضا کرسکتا تھا۔ آپ غور کیجئے کہ اتحاد کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اگر مختلف جماعتیں، پارٹیاں، گروہ، حتیٰ کہ مختلف اقوام کسی مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے مل کر کوشش کریں، تو اُسے اتحاد کہتے ہیں اور ان کے اس انداز کو متحدہ محاذ، جیسے 1977ء میں ملک کی مختلف پارٹیوں نے ایک مشترکہ مقصد کے لئے ''متحدہ محاذ'' قائم کیا تھا۔ اس اتحاد کے زمانے میں بھی ان میں سے ہر پارٹی نے اپنا اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھا تھا، اور جب وہ پروگرام ختم ہوگیا تو وہ پارٹیاں حسب سابق پھر منتشر ہوگئیں۔ اس سے واضح ہے کہ اتحاد، مختلف گروہوں میں ہوتا ہے۔ جیسے اقوامِ متحدہ کا ادارہ۔ اس میں ہر قوم اپنا اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھتی ہے۔

قرآن کا مقصد ''اُمتِ واحدہ'' کی تخلیق ہے اور ظاہر ہے کہ اُمتِ واحدہ میں مختلف پارٹیوں اور ان کے جداگانہ تشخص کا تصور تک نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اُمت میں اتحاد کے کیا معنی؟ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم اپنی موجودہ حالت اور مروجہ اسلام کو برقرار رکھتے ہوئے، دین یا قرآن کی بات کرتے ہیں۔ موجودہ مسلمان، اُمتِ واحدہ نہیں ہیں۔ ان میں مختلف قومیں، مختلف جماعتیں، مختلف پارٹیاں اور مختلف مذہبی فرقے ہیں۔ ان مختلف عناصر میں باہمی مخاصمت اور معاندت لازمی ہے۔ جب ہمیں ان کے اختلافات سے پیدا شدہ مضرات کا احساس ہوتا ہے تو ہم اس کا مداوا باہمی اتحاد میں تلاش کرتے ہیں اور اسے اسلام یا قرآن کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ یہ حضرات یا تو اسے سمجھتے نہیں اور یا ایسا برملا کہنے کی جرأت نہیں پاتے کہ اُمت جب مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہوجائے تو پھر نہ وہ اُمت، اُمتِ مسلمہ رہتی ہے، نہ ان ٹکڑوں میں سے کوئی ٹکڑا اسلامی ان میں اتحاد، مصلحتوں کا تقاضا ہوتا ہے، اسلام کا نہیں۔ اسلام کا تقاضا اُمت کی وحدت ہے۔۔۔ اتحاد نہیں۔

یاد رکھیئے! جب تک ہم اس بنیادی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ اُمت کا مختلف گروہوں، پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ جانا اسلام کی نقیض ہے، ہمارا کوئی قدم اسلام کی طرف نہیں اُٹھ سکتا۔

سانحہ ارتحال

بزم طلوعِ اسلام علیگرامہ سوات کے ایک بزرگ کارکن محترم مسین خان عرف سپین دادا ساکن ہزارہ کبل گذشتہ ماہ وفات پاگئے۔ نیز صوابی بزم کے ایک بزرگ کارکن سید مفرح شاہ باچا کرنل شیر کلے محلہ خود رخیل بھی گذشتہ ماہ وفات پاگئے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں بلند مقام عطا فرمائے۔ ادارہ لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 7

By G. A. Parwez (Episode No.1)
(Translated by: Mansoor Alam)

My dear friends, today is February 26, 1982 and today's lecture starts with verse (47:34) of Surah Muhammad (محمّد).

If you remember, the previous verses that we covered in the last lecture dealt with the struggle between THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل). This struggle has been going on throughout human history and will continue until eternity. Iqbal expresses this Quranic reality thus:

This perpetual struggle has always existed
Amid Muhammad's light and Abi Lahab's fire

The Quran recognizes only two groups, only two nations, only two parties in the world – one that accepts the Quran as *the* guidance for humanity and believes in Prophet Muhammad (PBUH) as His last Messenger; and the other which does not. By the way I could mention here that this principle of the Quran was the basis of our two-nation theory and hence the demand for Pakistan. The other group was opposed to this principle. The opposition forces form the other group. It does not mean that this opposition group necessarily fights in the battlefield. It means also that this group does not accept this principle as true, and it openly challenges this truth and engages in transgression against this principle.

If you remember, in many of these lectures, I had mentioned that one does not necessarily become a مومن (*Momin*) by being born in a Muslim family. One has to act upon the requirements to be a مومن (*Momin*). The Quran asks Muslims: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ (4:136) – O you who profess to believe! Hold fast unto your belief in Allah, His Messengers, the Book which He has sent to this Messenger, and those which He had sent earlier. This has to be done practically in order to be part of the first group. Every child by birth is neither مومن (*Momin*) nor کافر (*Kafir*). The child is born as a human being. Later he needs to choose one of this two ways by his own freewill with full acceptance of his heart and mind. The Quran uses verb for these two ways: whether one *acts* as believer (**آمنو**), or whether one *acts* as a disbeliever (**کفرو**).

We saw in the last lecture what it means by obeying Allah and obeying the Messenger: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (47:33) – O who you

claim to believe! You must follow and obey the Divine System that the Messengers has established, in its entirety. Do not ever take a step which causes your efforts to go waste. However, Abul Kalam Azad propagated a Brahmo Samaji version of Islam. He said that, anyone (belonging to any religion) who leads a virtuous life and worships God then the goal of Islam is achieved. The question is: what is virtuous life? In Hindu religion it is individual charity, e.g., keeping some salt and water for animals is a virtue. But this is not true in Islam. Islam requires Iman first. Doing individual worship and doing individual charity is not what Islam is about?

Life has a serious purpose

To have Iman in Allah is a positive action. In reality, it is a change in mindset. It is this foundation what we call Iman on which the structure of دین (*Deen*) – the way of Divine life – is erected. It is fountainhead of willpower; it is the goal that determines the destination; it is the kernel of life's decision making ability. It is the essence of Iman around which life revolves. Everything that is done according to it is a virtuous action. Anything that is against it is bad and evil. So, it requires obedience to the divine laws – now contained in the Quran – that takes humanity to the proper destination. This is where the دین (*Deen*) wants to take us. This is the path on which are our Prophet's shining steps to guide us. This is the path that takes us to the correct destination. This is called Islam. Contrary to this, religion takes us away from the path of دین (*Deen*) and all efforts go to waste: حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (2:217). Obviously, if one takes a wrong turn and continues then one gets further and further away from destination and one's efforts get wasted. Journey without destination is vagrancy. This is the way of religion. Every religion, on its own, thinks that it is doing pious work on individual basis. This is not what Islam teaches. Islam is a collective system that requires collective obedience of Divine Laws contained only in the Quran and nowhere else.

The difference between Quranic society and secular society

My dear friends, what we call secularism, it is a system in which people just don't talk the talk but also walk the talk, spend time and effort, and get tired – but the result of this is not what takes humanity to the proper destination. Therefore: وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (47:33) – Do not ever take a step which causes your efforts to go waste. Please notice here that this is not something to be done individually. This is a system of life whose obedience is to be done in order that the caravan of life reaches its destination. Contrary to this: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّـهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يَغْفِرَ اللَّـهُ لَهُمْ (47:34) – If those who deny the Divine Laws and obstruct others from adopting the Divine Order do not change their ways and die while continuing doing so, they will never be protected from the adverse consequences of their erroneous deeds. Therefore, if one is not punished in this world, it does not mean that he is saved from retribution. The consequences of one's deeds have to be faced after death. The first group (described earlier in verse 47:33) is traveling to the correct destination – but the second group not only does not accept that destination but even put roadblocks in the path of the

first group. And thus these second group commits two crimes: First, they themselves are not traveling to the correct destination and second, they are putting roadblocks in the path of those who are traveling to the correct destination.

The religious and spiritual roadblocks in the path of Quranic society

My dear friends, the Quran clearly identifies who are the people who put roadblocks in the path of Allah: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (9:34) – O Believers! A good many of the spiritual leaders and religious priests devour others' property and turn them away from Allah's path. There are others who hoard gold and silver and do not keep it open for use in the way of Allah. For both are tidings of grievous chastisement. On the Day of Reckoning, the gold and silver will be heated in the fire of Jahannam and their foreheads, sides and backs will be branded therewith, and it will be said to them: "This is what you had treasured up for your exclusive use and deprived the needy of it. Taste then your treasures which you had amassed."

Regarding the religious and spiritual leaders the Quran clearly says that they thrive on other people's wealth and do not work themselves. This is their first crime. The next thing the Quran mentions above is about capitalists. What is a capitalist? The Quran defines them as people thrive on other people's hard work just by investing money. Among the capitalists the biggest group is these religious and spiritual leaders because they thrive on other people's effort without investing even a penny. Therefore, there is no risk at all unlike those capitalists who invest money. What could be more profitable business than this my friends? Not only that the very people who provide them sustenance also plead with them to accept their offerings; serve them with all their with their heart and soul; listen calmly to their angry words and keep pleading to them in prayers, and so on and so forth…

Our credulity to believe religious and spiritual scholars in spite of Quran's warning

Whenever religious scholars explain any Quranic verse, they start with what is called "Shaan-e Nuzul" or reason for its revelation. Then they start telling that such and such verse is about Jews; that such and such verse is about Christians; that such and such verse is about the Mushriks of Quraysh etc. When questioned: Well, is there anything about us too? Yes, of course, there is they tell us: Jannah is for us. But the Quran is addressing Muslims: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (9:34) – O Muslims believers! A good many of your spiritual leaders and religious priests devour people's wealth and turn them away from Allah's path. And: وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (9:34) – There are others who hoard gold and silver and do not keep it open for use in the way of Allah. O Prophet (PBUH) announce: فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (9:34) – For both are tidings of grievous chastisement. And: فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ (47:34) – they will never be protected from the adverse consequences of their erroneous deeds.

The struggle between THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل) had been going on throughout human history. Every page of the Quran reflects the story of this struggle in one form or the other describing the many challenges that happen in the course of this struggle. The Prophet (PBUH) and the مُؤْمِنِين (*Momineen*) had to deal with more or less eighty two battles in Medina during the ten years of the Prophet's life. Then the Quran tells the مُؤْمِنِين (*Momineen*) to remain steadfast in the ongoing battle: فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (47:35) – Now that war with these opponents is imminent, do not be disheartened and do not minimize your struggle (because of activities of the hypocrites); nor call for peace by considering yourself weaker and subdued. Rest assured that you shall overcome them due to the support and assistance provided by Divine Laws. He shall never reduce the consequences of your efforts. He will never let you down.

A golden rule in battlefield

The Quran ordered the مُؤْمِنِين (*Momineen*): if the enemy surrenders during a battle – even though you may have the upper hand and about to win – then accept the overture of peace. Do not presume that the enemy is tricking you although that may be the case. Regardless, you give the benefit of doubt and accept the surrender. If it turns out that this was a trick then be always prepared to fight back. This is a message for humanity's benefit. If they were honest in making peace and you killed them thinking they were tricking you then this will be a crime against humanity. On the other hand, you do not make peace overture to an enemy because the enemy will exploit you and think that you are weak. This will create inflection in their hearts and they will take advantage of you.

The Quranic order will never let مُؤْمِنِين (*Momineen*) down

Quran states: وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ (47:35) – Rest assured that ultimately you shall dominate them; that you will be victorious. هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (48:28) – This is because Allah has sent his Messenger with the Divine Code, which is a system based on absolute truth. It can thus overcome all other manmade systems. This can only happen if the مُؤْمِنِين (*Momineen*) become powerful and strong enough to wipe out the false systems based on injustice and establish the Divine Order instead. وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (3:139) – O party of مُؤْمِنِين (*Momineen*)! Do not lose heart nor be depressed for you shall surely dominate, provided you are true believers. My dear friends, please note that this is being told about مُؤْمِنِين (*Momineen*) not us, born Muslims, because as we saw Allah is asking us also to acquire Iman! Considering oneself as **مومن** (*Momin*) by being born in a Muslim family is a great delusion. The Quran puts the condition of being مُؤْمِنِين (*Momineen*) as those over whom the unbelievers will never have domination.

A great lesson from a prisoner in the court of 'Umar (R)

We have the illusion that we are مُؤْمِنِين (*Momineen*) but every group in the world dominates over us whereas Allah says that no one can dominate مُؤْمِنِين (*Momineen*) because وَاللَّهُ مَعَكُمْ — Allah is with them. What it means that Allah is with the مُؤْمِنِين

(*Momineen*), my friends? If you remember I often repeat the story of Harmuzan (the Iranian governor) who was brought back to Medina as prisoner of war after Iran was defeated during Khalifa Omar's caliphate. Omar (R) asked him: Before, you used to dismiss Arabs and you even felt beneath your dignity to fight them. So, what happened this time? What was the reason that Iran lost the war and its ruler was running around seeking shelter and was killed by a water wheel under which he was hiding? Harmuzan replied: When we fought the Arabs before, there were Arabs one side and the Iranians on the other side. It was not difficult for us to defeat the Arabs. But now the Arabs and their God are on one side and we Iranians are on the other side. What to say Iran even the whole world cannot defeat them. My dear friends, Harmuzan knew what it means: وَاللّٰـهُ مَعَكُمْ – That Allah is with you.

Allah is with those who chart their destination of life according to the Quran and proceed fearlessly towards it. In fact, Allah says: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (57:4) – He is with you wherever you happen to be. Since Allah is everywhere so why the emphasis especially in the fight between THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - بـــاطل)? Because: وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللّٰـهُ مَعَكُمْ (47:35) – Be assured that you shall dominate because Allah is with you. Since your caravan is proceeding on the most balanced and straight path – الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ – under the guidance of Allah, so, He is with you. Because you have synchronized your will with the Will of Allah: وَاللّٰـهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (47:35) – Rest assured that you shall overcome forces of FALSEHOOD (*Baatil* - باطل) due to the support and assistance provided by Divine Laws. He shall never reduce the consequences of your efforts. He will never let you down.

So, we have this group that has only the material interests as its goal. There is no higher goal in front of it. The Quran says that this kind of life is a life at the animal level. This is the life of secularism; this is the life of Kufr. This group enjoys material things, indulges in comforts of life, and dies. The other group thinks that material things are only the means to achieve a higher goal. And that higher goal is the establishment of دین (*Deen*) in this world that will place the caravan of humanity on the road that has been set by Allah. In secular life one is always afraid of death. Even a lowly ant fights obstacles in its path in order to survive. Preservation of self is demand of inner life. Life wants its protection. This is fundamental thing, and up until this point, the life of Momin and the life of Kufr share this common part. But, then comes the difference between the two lives.

Difference in the concept of life of Momin and Kafir

Yes, it is important to preserve the physical life by all means. But death is not the end of life. Death only destroys the physical life. However, a Momin is one who gives his physical life for the sake of THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) during fight between TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل) in order to achieve eternal life. The Quran says that Kafir is afraid of death but, you O Momin, embrace death for the sake of *Al-Haq* (الحق). Do you see my friends, the extremely contrasting

difference between the two mindsets? The Quran told this in few words. The Quran opens the door for a Mujahedin to achieve eternal life. History cannot provide any similar examples of the miraculous victories that were achieved in battles during the Prophet's life and the rightly-guided Khalifas. Allah's Mujahedin fight for the establishment of the system of universal sustenance that fulfils people's needs including that of Mujahedin's family. But the Kafirs fight for material wealth and power under auspices of capitalists who exploit them. And they are always afraid of death because they worry about what will happen to their families if they die. The mujahedin, on the other hand, fight with their heart and soul with conviction that death will open the door for eternal life, and therefore they are not afraid of death. The Quran offers glowing tribute to them: إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ ۚ وَإِن تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ (47:36) – Also remember that your aim should not be gains of this worldly life. You should keep your attentions focused on the sublime and permanent values of life. Worldly life and its gains are nothing more than a mere play and passing amusement. If you have firm faith in this reality, and in conflict between worldly gains and any permanent value if you guard the permanent value, then the Divine Law of Requital will grant you full reward for your efforts without asking for anything in return. Therefore, at this juncture, you should contribute whatever you can for the establishment of Divine Order. All this will be returned manifold to you.

Also, the Quran demands يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ (47:33). That means it is not a question of believing once but believing at every step of life at every moment. If we take a step towards the destination then after every step we get closer to the destination. Therefore we must protect ourselves – وَتَتَّقُوا (47:36) by taking the proper turn at each crossroad under the eternal guidance of divine laws. If at any crossroad the traveler takes a wrong turn then each step takes him further away from the destination. So, the divine guidance will tell the traveler that you have taken a wrong turn and he immediately returns to the crossroad from where he took the wrong turn. This is called **توبہ** (*Tauba*).

So, **توبہ** (*Tauba*) is an action, not reciting the words, "O Allah **توبہ** (*Tauba*)". It is going back to where one took the wrong turn. This is called **تابہ** (*Taaba*). But just returning there is not enough. After returning there one has to move forward towards the destination. This is called **اصلح** (*Asla'ha*). In the Quran **تابہ** (*Taaba*) and **اصلح** (*Asla'ha*) always come together. If there is no time for **اصلح** (*Asla'ha*) then **تابہ** (*Taaba*) is meaningless. If you keep doing **تابہ** (*Taaba*) and **اصلح** (*Asla'ha*) then the Quran says your efforts will keep on producing good result. يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ (47:36) –Then the Divine Law of Requital will grant you full reward for your efforts without asking for anything in return.

Next the Quran reminds Muslims: وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ (47:36) – Remember that at this juncture, the Prophet is trying to establish the divine order; he is trying to establish the divine government. In order to do this funds will be needed. Therefore, you should contribute whatever you can for the establishment of Divine Order. This

contribution of yours will be considered as the best loan (**قرض حسنہ**) that you give to Allah. This will be returned manifolds to you. This is like sowing one grain which produces seven hundreds grains. This will not be interest but the result of hard work.

The issue is very clear: every new system that is formed requires resources. Initially, the resources are spent in establishing the infrastructure and welfare institutions for the people. When this is done the system generates so much wealth and resources that it will be many times more, beyond your expectations; beyond your calculations; even beyond your comprehension. And the succeeding events in the life of Prophet (PBUH) and rightly-guided Khalifas proved that it did happen beyond human calculations. During Khalifa's 'Umar (R) rule the Islamic state expanded exponentially to more than two million square miles and the material resources increased beyond expectation so much so that even Khalifa 'Umar was surprised from the total tax revenue collected by Governor Abu Hurairah from his province.

Next the Quran says: إِن يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ (47:37) – If the Divine Order demands something from you in order to establish itself, you might be hesitant to part with your material possessions. If such demands kept forthcoming, then you would niggardly cling to them, out of sheer disgust, and so, you may say whatever is concealed in your heart. Unlike other manmade systems, keep in mind that this divine order will not adopt such a course of action as whatever it demands is for your own benefit. Hence give to it willingly.

The law of succession and substitution of nations

My dear friends, we now come to the last verse of Surah Muhammad (محمّد). For the second time we have come to the 26th Parah (**جز**) of the Quran. The Quran describes the law of rise, fall, and demise of nations again and again. It describes how the substitution of one nation occurs with another nation. Apart from natural disasters that totally destroy smaller nations, the Quran also describes how a nation enslaves another nation; how a nation destroys another nation and takes over.

Listen my dear friends, how the Quran addresses the مُؤْمِنِين (*Momineen*): هَا أَنتُمْ هَـٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّـهِ فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ ۖ وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ۚ وَاللَّـهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ ۚ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (47:38) – But some amongst you act miserly when asked to keep their wealth open for the Divine Order. They should know that the one who is miserly in this matter in fact harms none but himself, for Allah is indeed magnificent. Allah does not need you to give Him anything. It is for your growth that you need His system. Should you turn back from your commitment, He will replace you with another nation which will not be like you! This is so because the law for life, death and supremacy amongst nations is that only the nation with the correct system of life survives. Those nations which have a wrong system are destroyed and replaced by another nation that has a better system. The decisions about life and death of nations are taken in light of their ideologies and practical implementation of their program.

religious priesthood confuses people by making wild pronouncements such as: how can our limited mind understand the Quran whose author is all powerful, all wise, all knowing? How can the Almighty's giant Book enter into such a tiny coconut? This is how religious priesthood serves as a roadblock in Quran's path. But nothing happens to Allah except that they deprive themselves and the people from Allah's path and, as a consequence, all their effort goes waste. They will never be successful.

Heaven is the result of action in the light of the divine message

One may conjecture from this that since our actions will go waste then why bother with actions; so, let us concentrate on performing extra prayers and reciting Allah-u Akbar on the beads of rosary for Allah's forgiveness. No, that is not the case. The Quran says: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّـهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (47:33) – But O people who claim to believe! You should not think that all this will be done by Almighty Allah Himself and that you will have to do nothing. It is therefore extremely important that you should follow and obey the Divine System that the Messengers has established – in its entirety. Do not ever take a step which causes your efforts to go waste. Do not think that this will happen naturally and automatically or that Allah will do it –and you do not have to do anything?

This obedience of Allah and the Messenger that is mentioned in the above verse (47:33) are not two separate obedience, one obedience for Allah and another obedience of the Messenger. The term – أَطِيعُوا اللَّـهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ – is a comprehensive terminology specifically employed by the Quran for obedience to Divine System that the Messengers established and those who will continue to establish after the Prophet (PBUH). The Quran is telling the believers that establish this Divine System and follow it – and don't worry about the hypocrites and their system that is bound to fail. But after the rightly guided Khalifas, Muslims deviated from the Divine System that the Prophet had established.

So, the question begs: was this divine system linked only with the Prophet's life. No, that was not the case. The Quran is very clear on this point: وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّـهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّـهُ الشَّاكِرِينَ(3:144) – Take note that the system based on eternal divine principles is not to be forsaken by the death of an individual, no matter how important his position may be. This principle applies even to as great a personality as Muhammad (PBUH). He is no more than a Messenger from Allah. Messengers before him have passed away. If he dies or is slain, will you then turn on your heels thinking that the system is finished? Whosoever does so will not harm Allah in any way? Allah will reward those who remain steadfast out of their conviction that the system does not depend upon personalities and will continue as long as the Book of Allah is followed.

However, the obedience to the Prophet (PBUH) was completely changed by our religious priesthood. It proclaimed that obedience to Allah is to be done through the Quran and the obedience of the Prophet (PBH) will be done through hadith. Since there are many sects (Hanafi, Maliki, Hanbali, and Shafaii) in Islam,

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔



(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)



PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.77
ISSUE
05

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

